JULY 2008

ماہنامہ

گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

جولائی
2008

[redacted]

Reg: SR - 01

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

اللہ

صداقت

محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

- موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار
- رہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔
- وحدتِ اُمت، عالمی انسانیت اور فلاحِ آدمیت کا ترجمان۔
- فرقہ واریت، بغض اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ؕ

الاعراف۔205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے
ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح و شام
یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

ماہنامہ
آدمیت
برائے فلاح
گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاری**ؒ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 11 شمارہ 10 جولائی 2008ء، رجب 1429ھ

ایڈیٹر **وحید احمد**

سرکولیشن منیجر **میاں علی رضا**

مجلس ادارت

خالد مسعود، منیر احمد لودھی، ایئر کموڈو (ر) اعجاز الدین، پیر خان
عتیق احمد عباسی، ایم طالب، عبدالقیوم ہاشمی، پروفیسر غلام شبیر شاہد

قیمت ——— -/20 روپے   سالانہ فنڈ ——— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: info@toheedia.net

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
درس قرآن	ڈاکٹر غلام مرتضیٰؒ	1
قرآن کے ساتھ ہمارا سلوک	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	12
حقیقت موت وحیات	محمد شفیق عباسی	19
منافقین	امتیاز احمد	31
خوشیاں آپکی منتظر ہیں	نادیہ طالب	37
میوس بی جولی	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	41
پہلا مولود	----------	49
اِنسانی مسئلہ	علامہ عنایت اللہ خاں المشرقیؒ	56

درس قرآن

(ڈاکٹر غلام مرتضیٰ)

نام الرعد

اس سورۃ میں بادلوں کی تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مناسبت سے "الرعد" اس کا علامتی نام رکھا گیا ہے۔

زمانہ نزول

سیدنا حمزہؓ اور سیدنا عمرؓ کے ایمان لانے کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے اور سورۃ بھی اسی دور میں نازل ہوئی۔

مضامین

مسلمان ایک طویل عرصے تک کفار کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہے۔ جب ان مصائب اور مظالم کی انتہا ہو گئی تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! کوئی ایسا معجزہ ظہور پذیر ہو جائے جس کو دیکھ کر بھی کفار ایک دم مسلمان ہو جائیں۔ اس کی بابت ارشاد فرمایا کہ یہ ہماری سنت و طریقہ کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہٹ دھرمی اور بغض کی اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ اگر قبروں سے مردے بھی اُٹھ کر ان کو ایمان کی دعوت دیں تو یہ نہ مانیں گے۔

مکی زندگی کے آخری دور کی طرح اس سورۃ کا مرکزی خیال بھی سابقہ سورتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ یعنی اس سورۃ میں کتاب اللہ کی عظمت، اللہ کی جانب سے نازل شدہ ہونے کا تذکرہ، توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ ان عقائد کے روحانی و اخلاقی قواعد کا ذکر دلنشیں انداز میں کیا گیا ہے تاکہ سلیم الفطرت انسان ایمان کی طرف کھنچ آئیں اور اگر کوئی شخص حماقتوں اور جہالتوں کے غار سے نکلنا چاہے تو اس کیلئے بھی ترغیب و ترہیب اور مشفقانہ تلقین کے ذریعے غور و تدبر کا سامان موجود ہے۔ نیز شفقت و محبت کے متلاشی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اور آخر میں کفار کے اعتراضات کے جواب کے بعد مسلسل جد و جہد کرنے والے مسلمانوں کے لئے غیبی امداد کی تسلی بھی اس سورۃ میں موجود ہے۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المر ـ تلك ايت الكتب ط والذی اُنزل اليك من ربك الحق ولكن اكثر الناس لايومنونo

''یہ کتاب کی آیتیں ہیں جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے۔ یہ سچ ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔ (الرعد:1)

توحید کی دو بنیادیں۔

سورۃ کا آغاز قرآن مجید کی عظمت وسچائی کے تذکرے کے ساتھ ہے اور پھر اس کے بیشتر حصے میں توحید کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ توحید کی دو بنیادیں ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کیا جائے۔ یہی بات ہم اپنی نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ میں عرض کرتے ہیں:۔

o ایاك نعبدو ایاك نستعینo

''ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد کے طالب ہیں''۔(الفاتحہ:4)

غیر اللہ سے دُعا کی عمدہ مثال

گویا ہر نماز میں ہم یہ قول واقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ ہم کسی کی عبادت کریں گے اور نہ ہی کسی سے مدد مانگیں گے۔ یعنی اور کسی کے آگے دست سوال یا دست دُعا دراز نہیں کریں گے۔

اس بات کو قرآن مجید نے ایک بہت عمدہ مثال کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے۔

له دعوة الحق ـ والذين يدعون من دونه لا يستجيبون لهم بشیء الا كباسط كفيه الى الماء ليبلغ فاه وما هو ببالغه ـ وما دعا الكفرين الا فی ضللo

وللّٰہ یسجد من فی السموت والارض طوعا و کرھا وظللھم بالغدو والاصال ○

”اسی کو پکارنا (اسی سے مانگنا، اسی سے دُعا کرنا) برحق ہے۔ رہی وہ (دوسری ہستیاں) جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ اُن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ (انہیں پکارنا تو) ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر (اس سے درخواست کرے کہ اے پانی! تو میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دُعائیں بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتیں (مگر بس ایک تیر بے ہدف کی مثل ہیں۔) وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں“۔ (الرعد 14-15)

پانی کی مثال بڑی واضح ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پانی میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اس شخص کا حکم سنے۔ اس کے بعد اس میں اتنی قوت بھی نہیں کہ وہ وہاں سے چل کر یا اُڑ کر اس شخص کے منہ تک پہنچے۔ بالکل یہی کیفیت غیر اللہ کو پکارنے کی ہے کہ پکارتے رہیں مگر نہ اُن میں سننے کی صلاحیت ہے اور نہ اتنی قدرت ہے کہ کسی کی حاجت روائی کر سکیں۔

اللہ کی طرف رجوع اصل ایمان ہے

اس کے بعد اللہ رب العزت نے صراطِ مستقیم کا رستہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ویھدی الیہ من اناب ○

الذین امنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللّٰہ ۔ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب ○ والیہ ماب ○

الذین امنوا و عملوا الصلحت طوبی لھم وحسن ماب ○

”وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے، ایسے ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں میں اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو کہ اللہ کی یاد ہی (وہ چیز ہے جس) سے دلوں کو اطمینان

(نصیب ہوا کرتا) ہے (پھر) جن لوگوں نے (دعوتِ حق کو) مانا اور نیک اعمال کیے (وہ خوش نصیب ہیں) ان کیلئے خوش حالی اور (ان کیلئے) اچھا انجام ہے"۔ (الرعد: 27-29)

سب سے لذیذ عمل۔ یادِ الٰہی

دل کا اطمینان ہے تو وہ صرف اللہ کی یاد میں ہے۔ ایک عملی اور تجرباتی بات پیشِ خدمت ہے کہ اگر اس دنیا میں خوشی چاہتے ہیں تو اللہ کا ذکر کثرت سے کر کے دیکھئے۔ اللہ کے ذکر سے اللہ کا قرب نصیب ہوگا اور اللہ کے قرب سے زیادہ لذت کائنات کی کسی چیز میں نہیں مل سکتی۔ اسی لئے فرمایا کہ اللہ کا ذکر کرو، اسی سے لذت اور اطمینان نصیب ہوگا۔

معجزات صرف اللہ کے اختیار میں ہیں

اب توحید کے ضمن میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اور لوگوں کی پیروی نہ کریں:۔

قل انما امرت ان اعبداللّٰه ولا أشرك به ۔ اليه ادعوا وكذلك انزلنه حكما عربيا ۔ ولئن اتبعت اهواء هم بعد ما جاء ك من العلم مالك من الله من ولي ولا واق٥

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية ۔ وما كان لرسول ان ياتي باية الا باذن الله لكل اجل كتاب٥

يمحوا الله ما يشاءُ ويثبت ۔ وعنده أم الكتب٥

"اے نبی! تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤں۔ لہٰذا میں اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔ اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمانِ عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ چکا ہے، لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔ تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا اور کسی رسول میں بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی آیت اور نشانی خود لا کر دکھاتا۔ ہر دور کیلئے ایک کتاب

ہے۔اللہ جو کچھ چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہے، قائم رکھتا ہے۔ اُم الکتاب اسی کے پاس ہے"۔ (الرعد 36:39)

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ معجزات نبی اور رسول کی طرف سے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔ ہاں بظاہر یوں ہی لگتا ہے کہ معجزے آیت یا کسی نشانی کا ظہور نبی کی ذات سے ہو رہا ہے مگر ایسا نہیں کہ نبی جب بھی چاہے کسی معجزے کو صادر کر دے۔ ایسا کرنا مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں کسی نبی یا رسول کے بس میں نہیں ہے۔ معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم یا اذن سے صادر ہوتا ہے۔

سورۃ ابراہیم

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ایک دُعا کے تذکرے کی وجہ سے اس سورۃ کا علامتی نام "ابراہیم" رکھا گیا ہے۔

زمانہ نزول

اس سورۃ کا روئے سخن نبی اکرم ﷺ کی ذات کی طرف ہے اور مضامین کا انداز اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ سورۃ بھی مکی دور کے آخری حصے میں نازل ہوئی۔

مضامین

اس سورۃ میں سیدنا نوح، موسیٰ، ابراہیم، اسحٰق و اسمٰعیل علیہم السلام اور ان کی اقوام کا ذکر ہے۔ فرعون اور آل فرعون کے خصوصی ذکر سے مکہ والوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا کہ انسان نبی مرسل نہیں بن سکتا۔

ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء○

"ہم تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے، احسان کرتا ہے۔

(ابراہیم:11)

اور یہ ذکر اس لئے خاص طور پر کیا گیا کہ کفارِ مکہ کے ایمان لانے میں یہی رکاوٹ تھی اور اب کفارِ مکہ اپنی سرکشی و عناد اور ہٹ دھرمی کے باعث یہ سوچ رہے تھے کہ اس ذات والاصفات کو کس

طرح اپنے راستے سے ہٹایا جائے۔ اس کے جواب میں سابقہ اقوام کے طرزِ عمل کو اس آیت میں پیش کر دیا۔

وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا○

''اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم آپ کو یقیناً اپنی سرزمین سے نکال دیں گے''۔ (ابراہیم۔13)

اس کے بعد والی آیت کریمہ میں اس عذاب کا ذکر ہے جو ان پر اترا۔ نیز اس میں موجودہ کفار کیلئے زجر و توبیخ اور مسلمانوں کیلئے خوشخبری بھی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لنھلکن الظلمین○ ولنسکننکم الارض من بعدھم○

''ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے اور تم (مسلمانوں) کو ان کے بعد (اس) زمین پر سکونت دیں گے''۔ (ابراہیم:13-14)

سورۃ کے آخر میں مصائب و مشکلات کی حالت میں ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا ذکر بطور سبق کیا گیا ہے۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ ابراہیم کے آغاز میں قرآن پاک کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

الر۔ کتب انزلنہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید○

اللہ الذی لہ ما فی السموات وما فی الارض○

''الف، لام، را، یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ۔ ان کے رب کے حکم (کی توفیق) سے (اس خدا کے)

راستے پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے، وہ اللہ جو زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات کا مالک ہے"۔ (ابراہیم 1-2)

ان آیات میں ایک بات قابل غور ہے۔ ارشاد ہوا "یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لے آئیں" یعنی ایسا اگر ہوگا بھی تو صرف اور صرف اس کے رب تعالیٰ کی توفیق سے۔ جب کوئی انسان مسلمان ہے یا مسلمان ہوتا ہے تو اس میں اس کی اپنی کوئی بڑائی یا اچھائی نہیں بلکہ یہ تو صرف اور صرف اس ذات باری تعالیٰ کے کرم کا نتیجہ ہے کہ وہ جس کو توفیق دے، وہ نیکی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔

مقصد کتاب

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم۔

"ہم نے اپنا پیغام دینے کیلئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم کی زبان ہی میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔ (ابراہیم۔4)

معلوم ہوا کہ اللہ کے پیغام کو سمجھانا نبی کا مقصد ہے اور اللہ کے پیغام کو بغیر سمجھے پڑھ گزرنا نبی کا مقصد نہیں۔ یہ ضرور رہے گا کہ اللہ کے کلام کے ہر حرف اور لفظ میں اپنے اپنے اثرات ہیں جو ہر حال میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی اپنی برکات ہیں اور یقیناً اس کا اپنی جگہ پر ہے بلکہ قرآن کو صرف دیکھنا بھی عبادت ہے لیکن مقصد صرف دیکھنا یا بغیر سمجھے پڑھنا نہیں بلکہ اصل مقصد اس کے اندر لکھے ہوئے احکامات و رموز کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہے۔

مشرکین کے شکوک

مشرکین اپنے آپ کو سچا اور مومنین کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے ہمیشہ ہی سے اللہ جل شانہ کی ذات اور انبیائے کرام پر شکوک کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ مشرکین کے ان شکوک کا جواب دیا گیا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں بھی ان شکوک کے متعلق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ مشرکین سے ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی اقوام عاد و ثمود کے حالات جان کر بھی تمہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین نہیں آتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

الم یاتکم نبوا الذین من قبلکم قوم نوح و عاد و ثمود والذین من بعدهم ، لا یعلمهم الا اللّٰه جاء تهم رسلهم بالبینت فردوا ایدیهم فی افواههم وقالو انا کفرنا بما ارسلتم به وانا لفی شك مما تدعوننا الیه مریب○

قالت رسلهم افی اللّٰه شك فاطر السموت والارض، یدعوکم لیغفرلکم من ذنوبکم و یوخرکم الی اجل مسمی، قالوا ان انتم الا بشر مثلنا ، تریدون ان تصدونا عما کان نعبد اباؤنا فاتونا بسلطن مبین○

قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللّٰه یمن علی من یشاء من عباده ، وما کان لنا ان ناتیکم بسلطن الا باذن اللّٰه ، وعلی اللّٰه فلیتوکل المومنون○

"کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے قبل گزر چکی ہیں؟ قوم نوح، عاد و ثمود اور اُن کے بعد (آنے والی بہت سی قومیں) جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے، ان کے رسول جب اُن کے پاس صاف صاف (باتیں اور کھلی کھلی) نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم (اس کو) نہیں مانتے اور تم ہمیں جس چیز کی دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم (سخت خلجان آمیز) شک میں (مبتلا) ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں شک ہے (جو) آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہیں (تمہارے قصور) معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقررہ تک مہلت دے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم (کچھ) نہیں ہو مگر (ہمارے ہی) انسان، جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان (ہستیوں) کی بندگی سے دور رکھنا چاہتے ہو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا (کے زمانے) سے ہوتی (چلی آ رہی) ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند۔ اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا: واقعی

ہم (بھی) تمہاری طرح ہی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نوازتا ہے اور یہ (ہمارے) اختیار میں نہیں (ہے کہ) تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آ سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے''۔ (ابراہیم 9-11)

تمام انبیاء نوع بشر میں سے ہیں

یہاں پر ایک اور شک کے بارے میں بھی وضاحت کی جا رہی ہے کہ تمام انبیائے کرام نوع بشر ہی سے آئے ہیں۔ وہ فرشتے یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔

ان حقائق کو سننے کے بعد کافر ماننے کے بجائے یوں دھمکی دیتے ہیں کہ ''تم یہ باتیں چھوڑ دو ورنہ تمہیں شہر بدر کر دیں گے''۔

اللہ تعالیٰ ان دھمکیوں کے جواب میں اہل ایمان کو تسلی دیتے ہیں۔ ہماری سنت اور طریقہ یہ ہے کہ ہم نافرمانوں کو مہلت دیتے اور پھر ہلاک کر کے زمین کو اس نجاست سے پاک کر دیتے ہیں اور پھر ان سب کو پھر جہنم میں گرا دیتے ہیں جہاں ان کو پانی کی جگہ پیپ پلائی جائے گی۔

مشرکین کا حسرت کرنا

اس مقام پر مشرکوں اور کافروں کے اعمال کی حقیقت بطور تمثیل مذکور ہے کہ ان کے اعمال جو وہ دنیوی زندگی میں نیکی اور بھلائی سمجھ کر کیا کرتے تھے ان کے کفر کے باعث راکھ ہو جائیں گے اور اس راکھ کے ڈھیر کو تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ اس کے ذرات دور دور تک بکھر جائیں گے اور یہ کافر حسرت و افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ان کو اپنے اعمال پر کوئی گرفت یا دسترس نہ ہوگی۔ اس کے بعد اہل دوزخ کا ایک حسرت بھرا مکالمہ مذکور ہے اس کو آپ قرآن مجید کے اپنے الفاظ میں پڑھیں۔

وقال الشیطن لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق و وعدتکم فاخلفتکم ، وماکان لی علیکم من سلطن الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلوموني ولوموا انفسکم ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخي اني کفرت بما اشرکتمون من قبل ۰

''اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم

سے کیے تھے، وہ سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور نہ تھا۔ میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے رستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں"۔ (ابراہیم 22)

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جہنم میں ڈالے جانے کے بعد سرا [illegible] ت وہاں مشرکوں اور شیطان کے مکالمے کو بیان کر دیا تاکہ انسان اس راہ پر چلنے والے غور و تدبر کے راستے پر چلیں۔

ایمان کی مثال

سورہ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی مثال ایک خوبصورت اور پر ثمر درخت سے دی ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہری ہوں اور جس کی شاخیں اور تنا بہت اوپر آسمان تک جا رہا ہو۔ اس کے مقابلے میں کلمہ کفر کی مثال جھاڑ جھنکار سے دی ہے کہ ہوا آئی اور اس کو اڑا کر لے گئی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء○ توتی اُکلھا کل حین باذن ربھا

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ درخت ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے"۔ (ابراہیم 24)

اہل ایمان پر رحمت

اہل ایمان کی ہدایت، رہنمائی اور تنبیہہ کیلئے ارشاد ہوا۔

قل لعبادی الذین امنوا یقیموا الصلوۃ وینفقوا مما رزقنھم سرا و علانیۃ من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلل○

"اے نبی میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے (راہِ خیر میں) خرچ کریں۔ قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔ (ابراہیم 31)

اہل ایمان کیلئے اس ہدایت کے بعد توحید کے دلائل ہیں اور پھر انعامات الٰہی اور احسانات کا یوں ذکر ہے۔

وان تعدوا نعمت الله لا تحصوها

"اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے"۔ (النحل 18)

پھر ابراہیم علیہ السلام پر کئے گئے انعامات اور احسان مندی کا اظہار بھی ہے۔ اس واقعے میں اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو مکہ میں چھوڑ کے جانے کا اور ایک عاشقانہ دعا مذکور ہے۔

رب اجعلنی مقیم الصلوة ومن ذریتی ربنا و تقبل دعاءo ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحسابo

"اے میرے رب مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) اے رب میری دعا قبول کر۔ اے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دے جب حساب قائم ہوگا"۔ (ابراہیم 61 60)

یہ دعا آج بھی اہل ایمان کیلئے ایک مستقل سبق اور دائمی وظیفے کا درجہ رکھتی ہے۔ ان سے عام طور پر نماز کا اختتام اس سے کیا جاتا ہے۔ بعض صحیح احادیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے لئے، والدین اور تمام مسلمانوں کیلئے مغفرت طلب کرنا اس دنیا میں انسان کی فراخی رزق کا سبب ہے اور آخرت میں مغفرت کا۔

سورۃ کا اختتام اہل دوزخ کے بدترین انجام کے ذکر کے ساتھ ہے۔

قرآن کے ساتھ ہمارا سلوک

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

برادرانِ اسلام! دنیا میں اس وقت مسلمان ہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کے پاس اللہ کا کلام بالکل محفوظ، تمام تحریفات سے پاک، ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں موجود ہے جن الفاظ میں وہ رسولِ برحق پر اترا تھا۔ اور دنیا میں اس وقت مسلمان ہی وہ بدقسمت لوگ ہیں جو اپنے پاس اللہ کا کلام رکھتے ہیں اور پھر بھی اس کی برکتوں اور بے حد و حساب نعمتوں سے محروم ہیں۔ قرآن ان کے پاس اس لیے بھیجا گیا تھا کہ اس کو پڑھیں، سمجھیں، اس کے مطابق عمل کریں، اور اس کو لے کر خدا کی زمین پر خدا کے قانون کی حکومت قائم کر دیں۔ وہ ان کو عزت اور طاقت بخشنے آیا تھا۔ وہ انہیں زمین پر خدا کا اصلی خلیفہ بنانے آیا تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ جب انہوں نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا تو اس نے ان کو دنیا کا امام اور پیشوا بنا کر بھی دکھا دیا۔ مگر اب ان کے ہاں اس کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں رہا کہ گھر میں اس کو رکھ کر جن بھوت بھگائیں، اس کی آیتوں کو لکھ کر گلے میں باندھیں اور گھول گھول کر پئیں، اور محض ثواب کے لیے بے سمجھے بوجھے پڑھ لیا کریں۔ اب یہ اس سے اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایت نہیں مانگتے۔ اس سے نہیں پوچھتے کہ ہمارے عقائد کیا ہونے چاہئیں؟ ہمارے اعمال کیا ہونے چاہئیں؟ ہمارے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں؟ ہم لین دین کس طرح کریں؟ دوستی اور دشمنی میں کس قانون کی پابندی کریں؟ خدا کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق ہم پر کیا ہیں اور انہیں ہم کس طرح ادا کریں؟ ہمارے لیے حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اطاعت ہمیں کس کی کرنی چاہیے اور نافرمانی کس کی؟ تعلق کس سے رکھنا چاہیے اور کس سے نہ رکھنا چاہیے؟ ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون؟ ہمارے لیے عزت اور فلاح اور نفع کس چیز میں ہے اور ذلت اور نامرادی اور نقصان کس چیز میں؟ یہ ساری باتیں اب مسلمانوں نے قرآن سے پوچھنی چھوڑ دی ہیں۔ اب یہ کافروں اور مشرکوں سے، گمراہ اور خود غرض لوگوں سے، اور خود اپنے نفس کے شیطان سے ان باتوں کو پوچھتے ہیں اور

انہی کے کہنے پر چلتے ہیں اس بے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے حکم پر چلنے کا جو انجام ہونا چاہیے وہی ان کا ہوا اور ساری کی ساری امت آج ہندوستان میں، چین اور جاوا میں، فلسطین اور شام میں، الجزائر اور مراکش میں، ہر جگہ بری طرح بھگت رہی ہے۔ قرآن تو خیر کا سرچشمہ ہے۔ جتنی اور جیسی خیر تم اس سے مانگو گے یہ تمہیں دے گا۔ تم اس سے محض جن بھوت بھگانا اور کھانسی بخار کا علاج اور مقدمہ کی کامیابی اور نوکری کا حصول اور ایسی ہی چھوٹی ذلیل بے حقیقت چیزیں مانگتے ہو تو یہی تمہیں ملیں گی۔ اگر دنیا کی بادشاہی اور روئے زمین کی حکومت مانگو گے تو وہ بھی ملے گی اور اگر عرش الٰہی کے قریب پہنچنا چاہو گے تو یہ تمہیں وہاں بھی پہنچا دے گا۔ یہ تمہارے اپنے ظرف کی بات ہے کہ سمندر سے پانی کی دو بوندیں مانگتے ہو ورنہ سمندر تو دریا بخشنے کے لئے بھی تیار ہے۔

حضرات، جو تم ظریفی ہمارے بھائی مسلمان اللہ کی اس کتاب پاک کے ساتھ کرتے ہیں، وہ اس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ اگر یہ خود کسی دوسرے معاملے میں کسی شخص کو ایسی حرکتیں کرتے دیکھیں تو اس کی ہنسی اڑائیں بلکہ اس کو پاگل قرار دیں۔ بتائیے اگر کوئی شخص حکیم سے نسخہ لکھوا کر لائے اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر گلے میں باندھ لے یا اسے پانی میں گھول کر پی جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ کیا آپ کو اس پر ہنسی نہ آئے گی؟ اور آپ اسے بیوقوف نہ سمجھیں گے؟ مگر سب سے بڑے حکیم نے آپ کے امراض کے لئے شفا اور رحمت کا جو بے نظیر نسخہ لکھ کر دیا ہے اس کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے رات دن یہی سلوک ہو رہا ہے اور کسی کو اس پر ہنسی نہیں آتی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ نسخہ گلے میں لٹکانے اور گھول کر پینے کی چیز نہیں بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی ہدایت کے مطابق دوا استعمال کی جائے۔

فہم قرآن اور عمل بالقرآن لازم ہے

بتائیے اگر کوئی شخص بیمار ہو اور علم طب کی کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جائے اور یہ خیال کرے کہ محض اس کتاب کو پڑھ لینے سے بیماری دور ہو جائے گی تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ کیا آپ نہ کہیں گے کہ بھیجو اسے پاگل خانے میں، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ مگر شافی مطلق نے جو کتاب

آپ کے امراض کا علاج کرنے کے لیے بھی ہے اس کے ساتھ آپ کا کیا برتاؤ ہے۔ آپ اس کو پڑھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بس اس کے پڑھ لینے ہی سے تمام امراض دور ہو جائیں گے۔ اس کی ہدایت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثال تیرا س سے پرہیز کی ضرورت ہے جس کو یہ نسخہ بتا رہا ہے۔ پھر آپ خود اپنے اوپر بھی وہ حکم کیوں نہیں لگاتے جو اس شخص پر لگاتے ہیں جو بیماری دور کرنے کے لیے صرف علم طب کی کتاب پڑھ لینے کو کافی سمجھتا ہے؟

آپ کے پاس اگر کوئی خط کسی ایسی زبان میں آتا ہے جسے آپ نہ جانتے ہوں تو آپ دوڑے ہوئے جاتے ہیں کسی اس زبان کے جاننے والے کے پاس کہ اس کا مطلب پوچھیں۔ جب تک آپ اس کا مطلب نہیں جان لیتے آپ کو چین نہیں آتا۔ یہ معمولی کاروبار کے خطوط کے ساتھ آپ کا برتاؤ ہے جن میں زیادہ سے زیادہ چار پیسوں کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ مگر خداوند عالم کا جو خط آپ کے پاس آیا ہوا ہے اور جس میں آپ کے لیے دین و دنیا کے تمام فائدے ہیں، اسے آپ اپنے پاس یونہی رکھ چھوڑتے ہیں۔ اس کا مطلب سمجھنے کی کوئی بے چینی آپ میں پیدا نہیں ہوتی۔ کیا یہ حیرت اور تعجب کا مقام نہیں؟

اللہ کی کتاب پر ظلم کا نتیجہ

یہ باتیں میں ہنسی دل لگی کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ آپ ان باتوں پر غور کریں گے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر ظلم اللہ کی اس کتاب پاک کے ساتھ ہو رہا ہے اور یہ ظلم کرنے والے بھی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بے شک وہ ایمان رکھتے ہیں اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہی اس پر سب سے زیادہ ظلم کر رہے ہیں۔ اور اللہ کی کتاب پر ظلم کرنے کا جو انجام ہے وہ ظاہر ہے۔ خوب سمجھ لیجئے اللہ کا کلام انسان کے پاس اس لیے نہیں آتا کہ وہ بدبختی اور ذلت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔

ما انزلنا علیک القرآن لتشقی ٥

ترجمہ: "یہ قرآن ہم نے اس لیے تم پر نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔

یہ سعادت اور نیک بختی کا سرچشمہ ہے، شقاوت اور بدبختی کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ کوئی قوم خدا کے کلام کی حامل ہو اور پھر دنیا میں ذلیل و خوار ہو، پاؤں میں روندی اور جوتیوں سے ٹھکرائی جائے، اس کے گلے میں غلامی کا پھندا ہو اور غیروں کے ہاتھ میں اس کی باگیں ہوں اور وہ اس کو اس طرح ہانکیں جیسے جانور ہانکے جاتے ہیں۔ یہ انجام اس کا صرف اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اللہ کے کلام پر ظلم کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کا انجام آپ کے سامنے ہے۔ ان کے پاس توراۃ اور انجیل بھیجی گئی تھیں اور کہہ دیا گیا تھا: (مائدہ ۶۶)

"اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان کتابوں کی پیروی پر قائم رہتے جو ان کے پاس بھیجی گئی تھیں تو ان پر آسمان سے رزق برستا اور زمین سے رزق ابلتا"۔

مگر انہوں نے اللہ کی ان کتابوں پر ظلم کیا اور اس کا نتیجہ یہ دیکھا۔

"ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گھر گئے۔ یہ اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے اور اس لئے کہ وہ اللہ کے نافرمان ہو گئے تھے اور حد سے گزر گئے تھے"۔ (بقرہ ۶۱)

پس جو قوم خدا کی کتاب رکھتی ہو اور پھر بھی ذلیل و خوار اور محکوم و مغلوب ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ ضرور کتاب الٰہی پر ظلم کر رہی ہے اور اس پر یہ سارا وبال اسی ظلم کا ہے۔ خدا کے اس غضب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کی کتاب کے ساتھ ظلم کرنا چھوڑ دیا جائے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر آپ اس گناہ عظیم سے باز نہ آئیں گے تو آپ کی حالت ہرگز نہ بدلے گی خواہ آپ گاؤں گاؤں کالج کھول دیں اور آپ کا بچہ بچہ گریجوایٹ ہو جائے اور آپ یہودیوں کی طرح سود خواری کر کے کروڑپتی ہی کیوں نہ بن جائیں۔

مسلمان کسے کہتے ہیں۔

حضرات، ہر مسلمان کو سب سے پہلے جو چیز جاننی چاہیے وہ یہ ہے کہ "مسلمان" کہتے کس کو

ہیں اور "مسلم" کے معنی کیا ہیں۔ اگر انسان یہ نہ جانتا ہو کہ "مسلم" کے کیا معنی ہیں۔ اگر انسان یہ نہ جانتا ہو "انسانیت" کیا چیز ہے اور انسان و حیوان میں فرق کیا ہے تو وہ حیوانوں کی سی حرکات کریگا اور اپنے آدمی ہونے کی قدر نہ کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو یہ نہ معلوم ہو کہ مسلمان ہونے کی معنی کیا ہیں اور مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کس طرح ہوتا ہے تو وہ غیر مسلموں کی سی حرکات کرے گا اور اپنے مسلمان ہونے کی قدر نہ کر سکے گا۔ لہٰذا مسلمان ہو اور مسلمان کے ہر بچے کو اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے تو اس کے معنی کیا ہیں، مسلمان ہونے کے ساتھ ہی آدمی کی حیثیت میں کیا فرق واقع ہو جاتا ہے، اس پر کیا ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے، اور اسلام کے حدود کیا ہیں جن کے اندر رہنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے اور جن کے باہر قدم رکھتے ہی وہ مسلمانیت سے خارج ہو جاتا ہے چاہے وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتا جائے۔

اسلام کے معنی

"اسلام" کے معنی ہیں خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا، اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا "اسلام" ہے۔ خدا کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خودمختاری سے دست بردار ہو جانا "اسلام" ہے۔ خدا کی بادشاہی و فرماں روائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا "اسلام" ہے۔ جو شخص اپنے سارے معاملات کو خدا کے حوالے کر دے وہ مسلمان ہے اور جو اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھے یا خدا کے سوا کسی اور کے سپرد کر دے وہ مسلمان نہیں ہے۔ خدا کے حوالہ کرنے یا خدا کے سوا کسی اور کے سپرد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے اس کو قبول کیا جائے، اس پر چون و چرا نہ کی جائے۔ اور زندگی میں جو معاملہ بھی پیش آئے اس پر صرف قرآن اور سنت رسول کی پیروی کی جائے۔ جو شخص اپنی عقل اور دنیا کے دستور اور خدا کے سوا ہر ایک کی بات کو پیچھے رکھتا ہے، اور ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے اور جو ہدایت وہاں سے ملے اس کو بے

چھوڑ کر مان لیتا ہے اور اس کے خلاف ہر چیز رد کر دیتا ہے وہ اور صرف وہی "مسلمان" ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے آپ کو بالکل خدا کے سپرد کر دیا، اور اپنے کو خدا کے سپرد کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص قرآن اور سنت رسول پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اپنے دل کا کہا کرتا ہے، یا باپ دادا سے جو کچھ ہوتا چلا آتا ہو اس کی پیروی کرتا ہے، یا دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہو اس کے مطابق چلتا ہے، اور اپنے معاملات میں قرآن اور سنت سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، یا اگر اسے معلوم ہو جائے کہ قرآن و سنت کی ہدایت یہ ہے اور پھر وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میری عقل اسے قبول نہیں کرتی اس لیے میں اس بات کو نہیں مانتا، یا باپ دادا سے تو اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے لہٰذا میں اس کی پیروی نہ کروں گا، یا دنیا کا طریقہ اس کے خلاف ہے لہٰذا میں اسی پر چلوں گا، تو ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں ہے۔ وہ جھوٹ کہتا ہے اگر اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔

مسلمان کے فرائض

آپ جس وقت کلمہ **لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ** پڑھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اسی وقت گویا آپ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ کے لیے قانون صرف خدا کا قانون ہے، آپ کا حاکم صرف خدا ہے، آپ کو اطاعت صرف خدا کی کرنی ہے، اور آپ کے نزدیک حق صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے ذریعہ سے معلوم ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مسلمان ہوتے ہی خدا کے حق میں آزادی سے دست بردار ہو گئے۔ اب آپ کو یہ کہنے کا حق ہی نہ رہا کہ میری رائے یہ ہے، یا دنیا کا دستور یہ ہے، یا خاندان کا رواج یہ ہے، یا فلاں حضرت یا فلاں بزرگ یہ فرماتے ہیں۔ خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سنت کے مقابلہ میں اب ان میں سے کوئی چیز بھی آپ پیش نہیں کر سکتے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ ہر چیز کو قرآن اور سنت کے سامنے پیش کریں، جو چیز اس کے مطابق ہو، قبول کریں، اور جو اس کے خلاف ہو اسے اٹھا کر پھینک دیں، خواہ وہ کسی باپ دادا کا طریقہ ہو۔ اپنے آپ کو مسلمان بھی

بنتا اور پھر قرآن و سنت کے مقابلہ میں اپنے خیال یا دنیا کے دستور یا کسی انسان کے قول یا عمل کو ترجیح دینا یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جس طرح کوئی اندھا اپنے آپ کو آنکھوں والا نہیں کہہ سکتا، اور کوئی بہرا اپنے آپ کو کان والا نہیں کہہ سکتا، اسی طرح کوئی ایسا شخص اپنے آپ کو مسلمان بھی نہیں کہہ سکتا جو اپنی زندگی کے سارے معاملات کو قرآن اور سنت کا تابع بنانے سے انکار کرے اور خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں اپنی عقل یا دنیا کے دستور یا کسی انسان کے قول و عمل کو ترجیح دے۔

جو شخص مسلمان نہ رہنا چاہتا ہو اسے کوئی مسلمان رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسے اختیار ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جو نام چاہے رکھ لے۔ مگر جب وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے تو اس کو خوب سمجھنا چاہیے کہ وہ مسلمان اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اسلام کی سرحد میں رہے۔ خدا کے کلام اور اس کے رسولؐ کی سنت کو حق اور صداقت کا معیار تسلیم کرنا اور اس کے خلاف ہر چیز کو باطل سمجھنا اسلام کی سرحد ہے۔ اس سرحد میں جو شخص رہے وہی مسلمان ہے۔ اس سے باہر قدم رکھتے ہی آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ اگر اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور مسلمان کہتا ہے تو خود وہ اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتا ہے اور دنیا کو بھی۔ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاُولئک ھم الکفرون** ○ (اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ المائدہ ۴۴) (خطبات)

انسان میں ایک صفت ایسی عجیب و غریب ہے جو جڑ اور بنیاد ہے ساری تمدنی ترقی کی۔ وہ صفت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں چھوٹی سی چھوٹی تکلیف کو بھی بے حد محسوس کرتا اور اسکو دور کر کے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کرنے کی کوشش میں دن رات مصروفِ عمل رہتا ہے۔ (تعمیر ملت۔260)

حقیقت موت وحیات

(محمد عتیق عباسی)

برادرانِ کرم۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ایک گروہ کے تصورِ حیات کے متعلق قرآن حکیم کی سورۃ انعام کی آیت نمبر 29 یوں بیان فرمایا۔

ان ھی الا حیاتنا وما نحن بمبعوثین

ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا۔ اس مضمون کا ارشاد سورۃ الدخان کی آیت نمبر 35 میں بھی ہوا۔

پھر ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔

ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر

(سورۃ الجاثیہ آیت نمبر 24)

کچھ نہیں بس یہی ہمارا جینا ہے دنیا کا ہم مرتے اور جیتے ہیں۔ صرف (گردش) زمانہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔

یہ ہمارا تصورِ حیات بس پیدائش سے موت تک کا ہے۔ اور حقیقتاً زندگی اسی وقفہ کا نام ہے۔ اگر ہم حواس خمسہ کی محدود دو قوتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور عالم محسوسات ہی میں مقید رہتے ہیں۔ تو کچھ بھی زندگی ہے۔ لیکن کیا ہم ذات باری تعالیٰ کی ودیعت کردہ عقل و دانش بینش اور وجدان کی قوت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تو عقل اور وجدان بھی اسے قبول کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔

یقیناً عالم محسوسات کے ذرائع ولادت سے قبل اور موت کے بعد کے بارے میں مجبور، بے بس اور لاچار ہیں۔ ذرا چشم بینا کو وا کیجئے۔ اس وسیع اور عریض کائنات کی وسعت و عظمت پر غور و فکر کیجئے، پھر تصور میں لائیں اور سوچیں تو معلوم ہوگا کہ خالق کائنات کے مقصد تخلیق و کمال ارتقائے حیات کی آخری منزل کا مرکزی، جو انسان ہی تو ہے۔

حیات انسانی کے محور و مقصد سے کوئی مطمئن ہو جاتا ہے تو ہوتا رہے۔ انہی کیلئے خالق کائنات نے فرمایا ہے۔

ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیوة الدنیا واطمانو۔

(سورۃ یونس آیت نمبر 7)

بے شک جو لوگ ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ اس دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔

آج اس روئے زمین پر انسان ہی نہیں بس رہے بے شمار تعداد حیوانات، چرند پرند اور دیگر جاندار بھی بس رہے ہیں۔ تو اس میں کونسی حیرت یا تعجب کی بات ہے۔ کہ خود انسانوں کا ایک گروہ یا اکثریت اپنی عظمت و رفعت سے غافل و لاعلم، بے خبر اور بے شعور حیوانوں کا سا ہو۔

قرآن حکیم اس کی تصدیق مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرما رہا ہے۔

لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان

لا یسمعون بھا

أولئك كالانعام بل ھم اضل

أولئك ھم الغافلونہ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 179)

ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہی لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدرجہا گمراہ ہیں یہی لوگ غافل ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتیں محض دنیاوی فوائد، حیوانی جذبات، مادی خواہشات کے حصول کے لئے وقف کئے ہوئے۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خصائل کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں یعنی فطری قوتوں سے کام لینے کی ان میں استعداد ہی نہیں

مالک حقیقی نے عرفان اور روحانیت کی جو فطری قوت اور استعداد ودیعت کی اسے غفلت، مادی خواہشات اور بے راہروی سے خود ضائع کیا اور کر رہے ہیں لیکن اس بد خصلت اور بے راہ روی سے نجات کے لئے اس سے اگلی آیت میں علاج بھی بتایا۔ کہ اللہ کی یاد اور اس کا ذکر ہی اس

سے ذریعہ نجات ہے۔ سوائں کو پکارو اور اس کی اچھی صفات کو یاد کرو۔

دیکھئے اگر ہم متذکرہ حیات انسانی کے تصور پر قائم رہتے ہیں تو گویا ہم اپنی عظمت ہی سے غافل اور نا آشنا ہیں تو پھر حیات کے حقائق کا ادراک کیونکر کر سکتے ہیں۔

ہاں البتہ جس کے سینہ میں قلب حقیقی حیات کے لئے روشنی لے رہا ہو جیسے اور قلب و روح عظمت و رفعت کی طرف بڑھ رہے ہوں تو اس وحی الٰہی و انوار الٰہی کے حقائق کی بارش سے عقل و وجدان کی پیاسی سرزمین کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ گویا سیراب حاصل ہوگیا جسکی پیاس تھی۔ اور حیات انسانی جو عام محسوسات کی بندگی میں مقید تھی آزاد ہوتے ہی بحر بیکراں کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

تو معلوم ہوگا کہ لاعلمی میں جسے ہم اصل حیات سمجھ بیٹھے ہیں وہ تو اصل کتاب حیات کی محض شروعات یا دیباچہ ہے۔

اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والاخرہ خیر وابقی (سورۃ الملک آیت نمبر 17)

تم دنیاوی حیات کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی اور باقی رہنے والی ہے۔

بھلائی اور بہتری کیسے حاصل ہو سکتی ہے جب آخرت کی فکری نہ ہو۔ دنیاوی زندگی یہاں کے عیش و آرام کو عملاً یا اعتقاداً اخروی زندگی پر اگر ترجیح دیتے رہیں گے تو۔ حالانکہ اس ناپائیدار فانی دنیا سے آخرت کہیں افضل بہتر اور پائیدار ہے۔ تو پھر اعلیٰ، افضل پائیدار اور فانی چیز کیلئے کیوں نہ سعی کی جائے

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر فرمایا

وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانو یعلمون٥

(سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔ کاش جانتے ہوتے۔ یہی نہیں سورۃ القیامۃ (آیت نمبر 22) میں تنبیہ فرمائی۔

کلا بل تحبون العاجلۃ وتذرون الاخرۃ

پھر نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ جبکہ نیز اس مضمون سے متعلقہ ارشادات سورۃ التوبہ، سورۃ رعد، سورۃ الحدید اور سورۃ عمران میں فرمائے۔

جس کا مفہوم یہی ہے کہ آخرت کے مقابل دنیا کی زندگی کو پسند کیا۔ جبکہ دنیوی حیات حیات اخروی کے مقابلہ میں قلیل، کمتر، متاع قلیل اور متاع غرور ہے۔

وہ ابدی ہے یہ عارضی، وہ لامتناہی یہ اختتام پذیر، کہاں یہ تصور اور وسعت نظر کہ حیات انسان ابدی اور سرمدی ہے۔ بجائے یہ تصور کہ موت مسلسل حیات کا اختتام ہے۔ بلکہ یہ حقیقت کہ موت تو اصل حیات کا دروازہ ہے۔ بقول اقبالؒ

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

لیکن یہاں انسانی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے۔ کہ حیات دنیاوی اگر اتنی ہی حقیر، کمتر، کم مایہ اور بے ثبات ہے تو تخلیق ہی کیوں کی گئی۔

غور کیجئے یہ سب حقیقت اور بے وقعت اس وقت تک ہے جب اس کا تقابل حیات اخروی سے کیا جائے۔ اگر صرف انتخاب خود ایک حقیقت ہے۔ بے معنی اور بے وقعت نہیں۔

جب کہ قرآن حکیم موت کو بھی حیات کی طرح حقیقت قرار دیتا۔

"خلق الموت والحیوۃ"

جو حیات اسی طرح خلق کی گئی ہے تو وہ حیات دنیاوی کو کیونکر بے حقیقت ٹھہرے گا۔ یہ متاع قلیل اور متاع غرور اس وقت قرار پاتی ہے۔ جب دل و دماغ، ذہن و روح سے حیات اخروی اوجھل ہو اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہو؟ خیال تک نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس حالت کے متعلق فرمایا۔

يعلمون ظاهرا من الحيوة الدنيا (سورۃ الروم آیت 7)

یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر، سطحی طور پر جانتے ہیں۔

کتنے لوگ بے خبر ہیں کہ اسی دنیاوی حیات میں ہی حیات آخروی کا راز پنہاں ہے۔

آخرت کا ناتو ہمیں وراثت میں بھی مل گیا لیکن جس قدر دنیا آسانی سے اس قدر رہ جاتا دشوار ہے۔ اس کے حصول کے لئے بھی تو اس دنیاوی زندگی میں ہی سرگرم رہنا ہے۔

آخرت سے قطع نظر اس جہاں میں دیکھئے کہ انسان، قبیلہ یا قوم کو عروج او کمال حاصل ہوتا ہے۔ پھر یہیں ہی آخری انجام ذلت، رسوائی اور ناکامی ہوتا ہے۔ یعنی ظاہر ہی اس دنیا کو جانا۔ حقیقت سے کب واقف ہوئے۔ حقیقت کی طرف توجہ ہو حیات انسانی کے مقاصد اور حمد حقائق کی رسائی تک راہیں کھل جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس حیات کو امتحانی وقفہ قرار دیا ہے۔

خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (سورۃ الملک آیت 2)

موت و حیات اس لئے خلق کی گئی۔ ہماری صلاحیتوں کی جانچ پڑتال کی جائے۔ ہم انکو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ کون اچھے سے اچھے نیک کام کرتا ہے۔ کون یاد الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ کون غافل اور برے کاموں میں مشغول ہے۔ اس زندگی میں امتحان ہوا نتیجہ دوسری میں نکلے گا۔ یہ دنیا میدان عمل ہے اگر یہ حیات دنیاوی نہ ہوتی تو عمل کون کرتا۔ موت نہ آتی تو سوچ سے غافل ہو کر عمل ہی چھوڑ دیتے۔ دوبارہ زندہ نہ کئے جاتے تو یہ امتحان گاہ کیسے ہوتی۔ اچھے برے کا نتیجہ اور بدلہ کہاں ملتا۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل اگر کوئی دفتر میں ہے

نبی کریم ﷺ نے تو دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا ہے۔

"الدنیا مزرعة الآخرة"

الغرض حیات دنیاوی کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ مگر دنیا کا کوئی حقیقی وجود نہیں رہتا ہے بلکہ سوائے اس کے اور یہ ہے کہ

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولہو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد۔ (سورۃ الحدید آیت 20)

ترجمہ: جان رکھو! دنیا کی زندگی محض تماشہ کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ زینت و آرائش باہم فخر و خود ستائی بڑائی کرنا آپس میں مال و دولت کی کثرت اور اولاد کی خواہش نے عصر حاضر میں کتنے لوگوں کو فرصت ہے کہ اس آرائش و زیبائش، شباب کے مباہات، فخر، کثرت اموال، اولاد کے مستقبل اور ایام و سور کے مادی دور سے گزرتے ہوئے۔ اللہ کے ودیعت کردہ عقل سے ہوش و خرد کے ناخن لیں۔ اور ابدی و لافانی روحانی حیات کیلئے بھی سعی کریں۔ جس سے حیات دنیاوی ایک نعمت غیر مترقبہ یعنی حقیقت کبریٰ سے جلوہ گر ہو جائے۔

اگر ایسا ہو جائے تو یہی سرمایہ حیات اور حاصل حیات ہے لیکن یہ ہوش اور خرد بھی بڑے نصیب کی بات ہے۔ جو اللہ کے فضل و کرم اور ان کے ذکر و فکر کی برکت سے ہی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر حقیقت کبریٰ کی ایک جھلک ہی دیکھ پائیں تو پھر اس کے پرستار بن جائیں۔ اور زندگی مجسم پیار بن جائے۔ پھر یہاں بھی سکون اطمینان سے بسر ہوگی اور آخرت میں ملنے والی نعمتیں انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ ایسے نیک بخت آخری وقت میں موت کا بھی مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے استقبال کریں گے۔ اور اس جہاں میں انھیں ایسا سماں ہوگا کہ **نورهم يسعى بين ايديهم وبايمانهم** (سورۃ التحریم آیت 8) ایسے نور ایمان جس کا منبع قلب اور اعمال صالح کی روشنی سامنے اور دائیں ہوگی۔ اور یہی خبر قرآن مجید سورۃ الحدید کی آیت نمبر 12 میں دے رہا ہے۔

جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے

راستہ میں دوڑتا ہوگا۔ آج تمہیں خوشخبری ہے۔

(مفسرین نے سامنے کا نور، قلب کا نور اور دائیں والے کو اعمال صالحہ کا نور فرمایا ہے)

لیکن کیا یہ نور علم روحانی سے بغیر، روحانی اور تزکیہ نفس و روح کے بغیر ممکن ہے۔ نہیں ہرگز نہیں تو پھر کتاب الٰہی کو سینے سے لگا کر اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہو جانا ہی فلاح دارین کی ضمانت ہے مگر جب تک امن سکون اور تسکین ہی نہیں بلکہ مشاہدہ حق اور معرفت کی بڑھتی ہوئی طلب کو بھی قرار دے گا۔ روحانی راحت نصیب ہوگی یہاں تک کہ فضل ربانی سے اس حقیقت الحقائق حقیقت کبریٰ کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ قرآن حکیم نے اس کی تصدیق فرمائی ہے۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ۔ (سورۃ القیامہ آیت 23)

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہشاش بشاش ہوں گے اپنے رب کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوں گی۔ بہت سے اکابرین اور صوفیائے کرام نے اپنے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے فرمایا ہے کہ مومنین کو جب موت آتی ہے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ بصورت دیگر جب وہاں اٹھائے جاؤ گے تو حسرت و یاس سے پکارو گے۔

رب لم حشرتنی اعمی وقد کنت بصیرا (سورۃ طٰہٰ آیت 125)

میں تو دیکھنے والا تھا مجھے کیوں اندھا اٹھایا۔

جس کسی نے یہ سمجھا کہ جسد خاکی سے روح پرواز کر گئی اور قصہ تمام ہوا۔ وہ جاہل مطلق تھا، بلکہ بدکار تو دوزخ میں اس حال میں ہوگا۔ نہ تو زندوں میں ہوگا اور نہ ہی مردوں میں۔

ثم لا یموت فیہا ولا یحییٰ (سورۃ الاعلیٰ آیت 13)

اس میں نہ تو مرے گا اور نہ ہی جیئے گا۔

عذاب دوزخ سے نجات اور نہ ہی موت آئے گی۔ اس کی مزید تصدیق سورۃ الدخان آیت 56 سے ہوتی ہے۔

لا یذوقون فیہا الموت الا الموتۃ الاولیٰ O

نہ چکھیں گے کہ موت کا مزہ مگر جو پہلے آ چکی۔

یعنی جو موت آ چکی سو آ چکی۔ آگے دوبارہ کبھی نہیں آنے کی۔ اس حال میں رہنا پڑے گا۔

تو حاصل مباحثہ یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں تضاد نہیں بلکہ موافقت ہے۔ دونوں ہم آغوش اور ایک دوسرے سے باہم پیوست ہیں۔ ایک ہی انسانی حیات کا تسلسل ہے جس سے جو یہاں دیکھے وہی وہاں دیکھ سکے گا

ومن کان فی هذه اعمی فی الاخرة اعمی واضل سبیلا۔

(سورۃ بنی اسرائیل آیت 72)

جو کوئی اس جہان میں اندھا رہا وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اور بہت دور پڑا ہوا راہ سے۔ جس کی جیسے یہاں حقائق پر پردہ رہا وہ یہ کہ حقیقت کبریٰ کے جلوے سے وہاں محروم رہے گا۔

غور کریں اس دنیاوی حیات کی اہمیت اور عظمت پر اس لئے خالق کائنات نے فرمایا۔

هل یستوی الاعمی والبصیر (سورۃ الانعام آیت 5)

کیا برابر ہو سکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا۔ قرآن حکیم ہی یہ پوچھ رہا ہے۔

هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ (سورۃ الزمر آیت 9)

کیا علم رکھنے والے سمجھدار اور بے سمجھ برابر ہو سکتے ہیں۔

تو یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جاننے اور نہ جاننے، سمجھنے اور نہ سمجھنے، علم و بے خبری اور خبرداری کا ہی تو اصل فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح مقولہ ہے۔ کہ "علم نیکی ہے اور جہالت بدی"

یہ جاننے اور نہ جاننے کے سبب ہی تو چار سو دنیا میں انسان غیظ و غضب، عداوت، حسد و بغض، کینہ، حرص و لالچ میں مبتلا ہیں۔ معمولی معمولی خواہشات اور طمع میں سرگرداں و گرفتار ہیں۔ اور اسی کی خاطر دوسرے انسانوں پر ظلم ڈھاتے اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری مول لیتے ہیں

انسان کا حقیر اور کم تر اشیاء کو پا کر خوشی سے پھولے نہ سمانا۔

معمولی تکالیف، مصائب، چھوٹی چھوٹی مشکلات اور محرومیوں پر حسرت و یاس کی تصویر بن جانا۔ جہالت کے یہ سب شاہکار ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

لیکن چشم بینا سے دیکھئے قلب، ذہن کی وسعت کا تصور میں۔ یہیں تو حیات دنیاوی کی منزل تو موت کی سرحد سے بہت آگے ہے۔

حدیث مبارکہ ہے کہ

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دنیا میں ایسے رہو گویا تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر ہو۔ یعنی یہ دنیا تمہاری منزل نہیں ہے اس لئے اس سے دل نہ لگاؤ۔ مسافر کی طرح راہ میں آنے والی چیزوں سے استفادہ ضرور کرو لیکن یہیں ڈیرہ نہ ڈالو۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ صاحب بصیرت بننا ہے یا صاحب آنکھ۔ جبکہ اللہ نے تو واضح کر دیا ہے۔

پھر جس نے دیکھ لیا یعنی آنکھیں کھول لیں سو اپنے واسطے اور جو اندھا رہا اس نے اپنے ہی لئے نقصان کیا۔ (سورہ انعام آیت 104)

سر کی آنکھوں سے اگرچہ اللہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ مگر اس کے بصیرت افروز نشانات، صفات اور دلائل تو ہمارے گرد و پیش اور اندر بھی موجود ہیں۔ جسے دل بینا عطا ہو گیا اس کی پیاس بجھ جائے گی۔ اس پر عیاں ہو جائے گا کہ یہ ادراک ہی کامل زندگی ہے۔ جس نے کوشش ہی نہ کی، وہ اندھا اور محروم رہے گا۔

جو حیات اخروی کی حقیقی نعمتوں (سب سے بڑی نعمت لقاء اللہ) پر نگاہیں جمائے ہوئے آگے بڑھے گا وہی حقیقت آشنا اہل دل یا صاحب نظر دوران حیات سے ہم آغوش ہوگا۔ اور ایسی نعمت سے نوازا جائے گا۔

جس کا ذکر حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

مالا عین رات ولا اذن سمعت وماخطر علی قلب بشر

جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا۔ نہ کسی کان نے سنا اور نہ اس کا ادراک کسی انسان کے قلب کو حاصل ہوا۔

حیات کا ایک رخ اور بھی ہے۔ کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم ثم

یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون○ (سورۃ البقرۃ آیت 29)

کس طرح کافر ہوتے ہو اللہ تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے۔ پھر زندہ کیا تم کو پھر مارے گا تم کو پھر زندہ کرے گا تم کو پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مذکورہ آیت مبارکہ سے یہ معلوم ہوا کہ حیات انسانی کا یہ دور جو حیات دنیاوی کہلاتا ہے دو موتوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایک اس سے پہلے اور دوسری اس کے بعد جیسے بعد والی موت بجائے خود زندگی ہی کا ایک وقفہ ہے۔ اسی طرح سے پہلے والی موت بھی زندگی ہی کا ایک وقفہ تھا۔ اس سے زندگی کی ابتداء اور انتہا نہیں ہے۔ جس طرح آنے والی موت کے بعد حیات اخروی کی شروعات ہے بالکل اسی طرح گزشتہ موت سے قبل ایک زندگی کا دور رہ چکا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں عہد الست کا سب سے بڑا واقعہ فطرت انسانی کی یاد کیلئے محفوظ فرماتا ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا۔ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 172)

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں تمہارا رب۔ بولے ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں۔

سب ابنائے آدم نے گواہی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر ایمان رکھے۔

تو کیا اتنا بڑا عہد کرتے وقت انسان کو اپنے وجود اور ہستی کا شعور نہ تھا؟ ہستی کا شعور تو تھا۔ وجود بھی تھا لیکن جسم نہیں تھا۔ یہ عالم موت کا دور تھا۔ جب اس عالم مادی میں انسان مادی جسم کے ساتھ آیا تو اسے عالم حیات کہا گیا۔ جب پھر عالم ارواح میں بغیر جسم کے چلا جائے گا تو اسے موت کہا جائے گا۔ دوبارہ مادی جسم سے اٹھے گا تو پھر اسے حیات کہا جائے گا۔

یقیناً ہر انسان نے اپنی ہستی اور تشخص کے شعور کے ساتھ ہی عہد کیا ہوگا ورنہ اس عہد کی حیثیت اور اہمیت کیا رہ سکتی تھی۔ تو سوچئے پھر حیات کس چیز کا نام ہے۔ صرف مادی جسم کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق ہے۔ حیات اولیٰ کی تصدیق اہل جہنم کی اس چیخ و پکار اور فریاد سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الی خروج من

سبیل (سورۃ مومن آیت 11)

اے ہمارے رب تو موت دے چکا ہم کو دوبار اور زندگی دے چکا ہم کو دو بار۔ اب ہم قائل ہوئے اپنے گناہوں کے پھر اب ہے نکلنے کی کوئی راہ؟ یعنی دو تحویل دو عالم موت میں جسم کے بغیر گزارے۔ اب جسم کے ساتھ حیات کا دورانیہ ہے

غور کیجئے۔ جب نکلنے کی راہ ہی تبدیل ہو جائے تو پھر فریاد سے کیا حاصل؟ کیا ہمیں اس سے قبل راہ نجات کے لئے حقیقی طریق پر نہیں چلنا چاہیے؟ رجوع الی اللہ نہیں کرنا چاہیے؟ بے شک وہ علیم و قدیر ہے۔ اس وجود اور ہستی کے حیات کے تسلسل پر غور فرمائیں۔

ہم پورے شعور کے ساتھ پہلے موجود رہے۔ ہم بغیر مادی جسم کے ایک روحانی وجود رکھتے تھے۔ اس دور کو ہی قرآن عالم موت قرار دیتا ہے۔ وہاں سے روحیں اللہ کے حکم پر اپنی اپنی باری پر مادی جسم کے لبادے میں مختصر سا عرصہ گزارنے کے لئے آتی رہتی ہیں۔ اسے "حیات" کا نام دیا گیا ہے۔ زمینی مہلت پوری ہو جانے پر پھر موت ثانی ہوگی۔ یعنی پھر سے جسم کے بغیر موت کی نیند سلا دیے جائیں گے پھر احیائے ثانی کا صور پھونکا جائے گا اور مردہ جاوید ہو جائیں گے۔ یعنی روحیں دوبارہ اپنے اپنے مادی جسموں کے ساتھ اٹھیں گی اور اسے بھی حیات کہا گیا ہے۔ گویا پہلے عالم موت تھا اور ہم اس میں روحانی طور پر موجود تھے پھر دنیوی حیات گزاری جس کے بعد پھر مادی جسم کے بغیر عالم موت میں چلے گئے تھے۔

کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون ٥ (سورۃ العنکبوت آیت 57)

ہر شخص موت (کا مزہ) چکھنے ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عظمت حیات کے ساتھ موت کی حقیقت بھی دیکھ لیجئے۔ زندگی کا فقدان نہیں بلکہ مسلسل حیات کی ہی ایک شکل اور کڑی ہے جو نیند سے مشابہت رکھتی ہے

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا

(سورۃ الزمر آیت 42)

اللہ کھینچ لیتا ہے جانوں کو (روح قبض کر لیتا ہے) جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو

نہیں مرے۔ ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں۔ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ نیند میں روح نکل جاتی ہے مگر اس کا تعلق بذریعہ شعاع بدن سے رہتا ہے۔ جس سے سلسلہ حیات جاری رہتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موت کے وقت بھی یہی چیز نکلتی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے بہتر کون حقیقت شناس ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا

واللہ لتموتن کما تنامون ثم لتبعثن کما تستیقظون۔ (الحدیث)

اللہ کی قسم تم ضرور مر جاؤ گے جیسے تم سو جاتے ہو پھر یقیناً اٹھا لئے جاؤ گے جیسے تم نیند سے جاگتے ہو۔ پھر نبی کریم ﷺ کی اس دعا کو یاد کریں اور غور فرمائیں۔ جو روزمرہ صبح آپ ﷺ کا معمول تھا۔

الحمدللہ الذی احیانی بعد ما اماتنی والیہ النشور۔

اللہ کی تعریف ہے۔ جس نے مجھے زندگی عطا فرمائی اس کے بعد مجھ پر موت طاری فرمائی اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

حقائق کے اس طرح واضح ہونے، انکشافات کے بعد ظلمات کے اندھیرے سے باہر نکل آئیں۔ اپنی خوشی اور اختیار سے ان چیزوں کو چھوڑیں جو حقیقت الحقائق، حقیقت کبریٰ کی بندگی میں مزاحم اور حائل ہوں۔

ذکر الٰہی کا سہارا لیتے ہوئے وجدان کی دوری میں تخیل، تصور اور چشم بینا کو لیجئے۔ تسلسل حیات انسانی کے مشاہدہ کی سعی کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو عجیب کیف سرور و مستی سے ہمکنار ہو پائیں گے۔ یہی حقیقت کا ادراک ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

اگر اس کے بیان میں مجھ سے کوئی خطا ہو تو اللہ تعالیٰ سے پناہ، گناہوں بخشش کا سوال کرتا ہوں اور آپ کے دل و دماغ سے اللہ تعالیٰ محو فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ والیہ انیب۔

منافقین

(اشتیاق احمد)

قرآن حکیم کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔

(۱) مومن (۲) کافر (۳) منافق

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مومنین کا مختصر ذکر فرمایا ہے۔ پھر کفار کا ذکر صرف ایک ہی آیت کریمہ میں کیا ہے اور آخر میں منافقین کے بارے میں انتہائی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

منافقین کا ذکر اتنی تفصیل سے اس لئے ہے کہ یہ معاشرے کے بدترین افراد ہیں۔ کفار سے کہیں زیادہ نقصان اسلام کو ان منافقوں کی وجہ سے پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان منافقوں کے کردار کو پوری تفصیل سے بے نقاب کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے دردناک انجام کی بھی مفصل خبر دی ہے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ان منافقین کے بارے میں کیا فرماتا ہے۔ سورۃ البقرۃ 8-9

ومن الناس من يقول امنا بالله وباليوم الاخر وما هم بمومنين٥
يخدعون الله والذين امنوا وما يخدعون الا انفسهم وما يشعرون٥

(ترجمہ) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہ (اپنے پندار میں) خدا کو اور مومنوں کو چکما دیتے ہیں مگر (حقیقت میں) اپنے سوا کسی کو چکما نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں۔

غور فرمایئے حالانکہ یہ منافقین اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور روز قیامت پر یقین کا دعویٰ بھی کرتے ہیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کرتے ہیں یہاں ان کے ایمان کا دعویٰ بیکار تھا۔ پس جب تک رسول ﷺ کی رسالت کا اقرار نہ کیا جائے کسی بھی بات کا یقین کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ سورۃ البقرۃ 10

فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا ولهم عذاب الیم بما کانوا یکذبون

(ترجمہ) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا کوئی معمولی گناہ نہیں ہے بلکہ جھوٹ وہ گناہ عظیم ہے جو ایک مومن کو منافق بنا دیتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ سورۃ الحج (30) میں جھوٹ کا بت پرستی کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں ارشاد ہوا ہے کہ ''اپنے آپ کو بت پرستی اور جھوٹ بولنے سے بچاؤ''

منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورۃ البقرۃ 11 12

واذا قیل لهم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون٥ الا انهم هم المفسدون ولکن لا یشعرون٥

(ترجمہ) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ دیکھو یہ بلاشبہ مفسد ہیں لیکن خبر نہیں رکھتے۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ سورۃ البقرۃ 13

واذا قیل لهم امنوا کما امن الناس قالوا انؤمن کما امن السفهاء الا انهم هم السفهاء ولکن لا یعلمون٥

(ترجمہ) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لائے تم بھی ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بےوقوف ایمان لے آئے ہیں اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟ سن لو یہی بےوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔

پس ایمان کی کسوٹی یہ ہے اور قابل قبول ایمان صرف وہ ہے جو کہ صحابہ کرام کی طرح کا ہو غور فرمائیے یہ صحابہ کرام کی کتنی عزت افزائی ہے

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور خصلت اس طرح بیان فرمائی۔ سورۃ البقرۃ 14-15-16

واذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا واذا خلوا الی شیطینهم قالوا انا معکم انما نحن مستهزءون٥ الله یستهزئ بهم ویمدهم فی طغیانهم یعمهون٥ اولئک

الذین اشتروا الضللة بالهدی فما ربحت تجرتهم وماکانوا مهتدین○

(ترجمہ) اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم (پیروانِ محمدؐ سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔

پس اللہ تعالیٰ منافقین کو مہلت دے رہا ہے کہ وہ منافقت سے باز آجائیں اور ان سے آتش مومنین کی روشنی کے اندھیرے میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو ہدایت کے بدلے گمراہی خرید رہے ہیں۔ اور یہ صرف نقصان کا سودا ہے۔

اس کے برعکس آپ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کے بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔ سورۃ الحدید 12

یوم تری المومنین والمومنت یسعی نورهم بین ایدیهم وبایمانهم بشرلکم الیوم جنت تجری من تحتها الانهر خلدین فیها ذالك هو الفوز العظیم○

(ترجمہ) جس دن (قیامت کے دن) تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان (کے ایمان) کا نور ان کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہے (تو ان سے کہا جائے گا کہ) تم کو بشارت ہو (کہ آج تمہارے لئے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی

یہاں کئی باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کے تحریک میں ہیں۔ روشنی ان کے داہنی طرف ہوگی یعنی ان کا اعمالنامہ ان کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اور روشنی یا نور سامنے ہوا تو یوں بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم تاریکی

میں راستہ طے کر رہے ہوتے ہیں تو نور یا روشنی ہمارے سامنے ہوتی ہے تاکہ ہمیں راستہ صاف نظر آئے۔

نور یا روشنی کا مومن مردوں اور مومن عورتوں کے آگے یا سامنے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ان کے اچھے کاموں یعنی دنیا میں تقویٰ اختیار کرنے کا انعام دیا جا رہا ہے۔ اس ایک نقطہ کی وضاحت کیلئے حضور ﷺ کی کئی احادیث کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوش خبری دو ان لوگوں کو جو رات کی تاریکی میں مسجدوں میں عبادت کیلئے جاتے ہیں۔ قیامت میں ان کے لئے ایک خاص قسم کا نور ہوگا۔ (ابن ماجہ)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگ خشوع و خضوع کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، ان کو قیامت کے دن ایک خاص نور عطا کیا جائے گا جو لوگ نماز کے سلسلہ میں اس کے برعکس ہوں گے ان کا حشر قارون، ہامان، اور فرعون کے ساتھ کیا جائے گا۔ (مسند احمد)

ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو کوئی جمعہ کے روز با قاعدگی سے سورۃ کہف کی تلاوت کرے گا، قیامت کے دن اس کو ایک نور عطا کیا جائے گا جو اس کے قدموں سے آسمان کی بلندیوں تک جائے گا۔ (طبرانی)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے کہ جس نے قرآن حکیم کی ایک آیت کی تلاوت کی اس کو قیامت کے دن ایک نور عطا کیا جائے گا۔ (امام احمد)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے کہ جس مسلمان نے مجھ پر درود وسلام بھیجا اسے ایک نور عطا کیا جائے گا جس کی روشنی میں اسے پل صراط کا راستہ طے کرنے میں آسانی ہوگی۔ (دیلمی)

اس طرح ہر نیک، متقی اور پرہیزگار مسلمان کو روز قیامت ایک خاص نور عطا کیا جائے گا۔ جبکہ کفار و منافقین کے لئے معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ منافقین اور کفار کے لئے

فرماتا ہے۔سورۃ الحدید 13-14-15

یوم یقول المنفقون والمنفقت للذین امنوا انظرونا نقتبس من نورکم قیل ارجعوا وراکم فالتمسوا نورا فضرب بینھم بسور لہ باب باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب ٥ینادونھم الم نکن معکم قالوا بلی ولکنکم فتنتم انفسکم وتربصتم وارتبتم وغرتکم الامانی حتی جاء امر اللّٰہ وغرکم باللّٰہ الغرور٥فالیوم لا یوخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا ماوکم النار ھی مولکم وبئس المصیر٥

(ترجمہ) اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہیں گے کہ ہماری طرف نظر (شفقت) کیجئے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں تو ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کو لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔ پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا جس کی اندرونی جانب تو رحمت ہوگی اور بیرونی جانب عذاب اور اذیت ہوگی۔ تو اس وقت منافق لوگ مومنوں سے کہیں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں تھے تو ضرور لیکن تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا اور ہمارے حق میں حوادث کے منتظر رہے اور اسلام میں شک کیا اور تمہاری آرزوؤں نے تم کو دھوکا دیا یہاں تک کہ خدا کا حکم آ پہنچا اور خدا کے بارے میں تم کو شیطان دغاباز دغا دیتا رہا تو آج تم سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ہی (وہ) کافروں سے فدیہ قبول کیا جائے گا تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے (وہی) تمہارے لائق ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

ابن کثیر کے مطابق پل صراط کا راستہ طے کرتے وقت مومنین اور منافقین دونوں کو روشنی عطا کی جائے گی لیکن منافقین کے سامنے سے یہ روشنی کچھ ہی دیر بعد بجھا دی جائے گی۔ یہ ان کے لئے سزا ہوگی اس مذاق کی جو یہ لوگ دنیا میں مومنین اور متقی لوگوں سے کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ 15:

اللّٰہ یستھزیٔ بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون٥

(ترجمہ) ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے۔ شرارت و سرکشی میں پڑے بہکتے چلے جائیں۔

غور کیجئے کہ منافقین کو دنیا میں تھوڑی سی روشنی صرف اس لئے عطا کی جائے گی کہ انہوں نے محض دکھاوے کی غرض سے تھوڑی بہت نیکیاں بھی کی تھیں

لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قیامت میں مومنین کے لئے مستقل انعام و اکرام ہوں گے جبکہ منافقین کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔

اس سلسلہ میں ابن کثیر نے ایک بہت طویل حدیث نقل فرمائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر مومن کو اسکی نیکیوں کے عوض ایک نور عطا کیا جائے گا۔ کسی کو پہاڑ کے برابر نور عطا ہوگا کسی کو کھجور کے درخت کے برابر کسی کو اس کے اپنے قد کے برابر نور عطا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

(سورۃ الحدید 17)

اعلموا ان اللہ یحی الارض بعد موتھا قد بینا لکم الایت لعلکم تعقلون

(ترجمہ) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے ہم نے اپنی نشانیاں تم سے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔

یہاں اللہ تعالیٰ ہمیں یہ وضاحت کرا رہا ہے کہ جس طرح وہ مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اسی طرح وہ منافقین کے مردہ دلوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ اگر وہ سچے دل سے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے راہ راست پر آ جائیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں نفاق سے بچائے اور ہمیں صحیح معنوں میں سچا اور پکا مسلمان بنائے تاکہ ہم سب کو بھی روز قیامت اللہ تعالیٰ وہ نور عطا فرمائے جس کی روشنی میں ہم جنت الفردوس میں داخل ہو سکیں۔

(آمین ثم آمین)

خوشیاں آپ کی منتظر ہیں

(نادیہ طالب)

انسان نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا اور کہاں تک جائے گا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ دیکھنا یہ ہے اس سفر میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ جہاں تک پانے کا تعلق ہے تو بہت کچھ پایا جدھر بھی نظر دوڑائی جائے ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے گویا ترقی "سائنس" ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آتی" کہ خدا کا شکر کیسے ادا کیا جائے شاید یہی وجہ ہے کہ کم شکر ادا کرتے ہیں اور جہاں تک کھونے کا تعلق ہے تو ہم نے سب سے اہم چیز کھو دی اور وہ ہے "دلی سکون" یہی وہ قیمتی چیز ہے جسے حاصل ہو جائے اسے پھر کسی اور چیز کی جستجو نہیں رہتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے کیسے حاصل کیا جائے؟

کیا یہ بے پناہ "سائنس" اور بے پناہ دولت کے حصول سے ملے گا۔ بالکل نہیں۔ کیا یہ چند کی عبادت اور ذکر و اذکار کی محفلوں میں جا کر حاصل ہوگا تو اس کا جواب بھی نہیں میں ہوگا۔ کیونکہ ذکر و اذکار سے بھی وقتی راحت ملے گی ادھر دنیا کے کاموں میں لگے نہیں ادھر ٹینشن دوبارہ شروع ہو گئی۔

ہمارا مقصد تو ایسا دلی سکون ہونا چاہیے کہ ہم خود طوفان کو دعوت دیں کہ آ میری طرف، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے میرا حد تو یہ ہے کہ تم جیسے کہ قبلہ حضرت انصاری صاحب کا شعر ہے

جستجو ہے قوم کو ایسے مسلمانوں کی
جن کو ملے ہو سکوں گود میں طوفانوں کی

گر دو پیش نظر دوڑائی جائے تو یقین مانیے افسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں ہماری لگام ہے یعنی ہمارا میڈیا وہ خود ڈپریشن میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس قوم کا کیا حال ہوگا جسکو سنبھالنے والے اپنی ہمت کھو بیٹھے ہیں۔ اخبار اگر پڑھیں تو دماغ کو ٹھکانے لگنے میں دن چند منٹ لگ جاتے ہیں۔ اور اگر ٹی وی آن کرو تو پھر تو جو پڑھا تھا اسے دیکھنے کے بعد ہمت جواب دے جاتی ہے اور پھر تو اس ملک سے بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے خبر ہی نہ پڑھی جائے مگر پھر کبوتروں کی طرح آنکھیں بند کیے کانوں میں روئی دیے بیٹھے رہیں۔ ایسا بھی

ہماری شان کے خلاف ہے تو پھر کیا کیا جائے؟

"مگر ہماری قوم میں اتنی مایوسی کیوں؟ اتنی ناامیدی تو قیام پاکستان کے وقت بھی نہ تھی۔ اب تو ماشاءاللہ سے ایٹمی طاقت بھی ہمارے پاس ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملک میں سب ضروریات زندگی دستیاب نہیں مگر کسی نہ کسی طرح مل تو رہی ہیں۔ حکمران جتنے بھی آئے غرباء کے حقوق تو سلب کرتے رہے ہیں مگر باقی کسر ہم نے خود پوری کر دی ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ سکون دیکھنا ہے تو غریب کی جھونپڑی میں جا کر دیکھو مگر اب وہاں سب سے زیادہ بے سکونی ہے جو وہاں سے خدا پر بھروسہ اٹھ گیا ہے اور یہی سب سے بڑا خطرہ نظر آ رہا ہے۔

اگر ماضی میں نظر دوڑائی جائے تو موجودہ صورتحال سے بھی زیادہ سخت مقام آئے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارے دلوں میں امید کی کرن روشن تھی۔ ہمارا خدا پر ایمان پختہ تھا۔ اس کے بھروسے پر ہم نے ہر مشکل کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ اخبار نویسوں نے اپنی اخباروں کی فروخت بڑھانے کیلئے ٹی وی چینلز نے اپنی پبلسٹی کیلئے حقائق کو اس انداز میں پیش کیا کہ عوام کے دلوں سے امید رخصت ہو گئی۔ لوڈ شیڈنگ کے ساتھ ساتھ دلوں کی بتیاں بھی گل ہو گئیں۔ حاصل یہ ہوا ہے کہ جب ہر کوئی ملک کو لوٹنے کی ریس میں شامل ہو گیا اور ہر ادارے کو طفل تسلیاں دے رہے ہیں حالانکہ بڑے بڑے پکے گھروں پر بے ایمانیاں ہو رہی ہیں میرے اس چھوٹے سے عمل سے کیا ہو گا یہی ہے اصل تباہی کی وجہ۔ پہلے ملک کے حالات سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اب لگتا ہے کیونکہ اب امید ختم کر دی گئی ہے خدا پر یقین کمزور کر دیا گیا ہے نا امیدی کفر ہے یہ علم و عرفان کا زوال ہے۔

یہ سب خدا کی غیرت کو للکارنے کے مترادف ہے کیا کوئی ایسی سپر پاور ہے جو خدا کے سامنے کھڑی ہو سکے؟ کوئی ایسا ایٹم بم ہے؟ جو خدا کی مرضی کے خلاف چل سکے؟ پھر ڈر کس بات کا آپ اپنے مدارج عمل درست کر کے خدا پر ایمان پختہ کرو اور پھر دیکھو وہ مدمقابل تو کیا میدان میں ایک طرف تم ہو اور دوسری طرف ہم اور ہمارا خدا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ایسی صورتحال میں جیت انہی اقوام کے حصے میں آتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ نے قرآن میں واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ میں نے تم سے تمہارے مال، جان، عزت اور تمام غم سے جنت کے بدلے خرید لیے ہیں تو پھر بے چینی کیوں۔ دولت جاتی ہے تو جانے دو، جان جاتی ہے تو جانے دو، لیکن اللہ پر یقین رخصت نہ ہونے پائے۔ اگر یہ چلا گیا تو سمجھو سب کچھ کھو دیا۔

کسی کو اپنا بنا لینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا
کسی کا بن جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے

اس کی طرف سے غم آئے تو اسے بھی سینے سے لگا لو بس اسی میں عافیت ہے کہ اللہ کے ہو جاؤ کہ یہ پیش خیمہ ہے خوشی کا جتنا بڑا غم ہو گا اتنی ہی بڑی خوشی ملے گی جیسے بیماری کی حالت میں کڑوی دوائی پی جاتی ہے یہ غم بھی ٹریٹمنٹ ہے۔ تاکہ صحت یاب ہو کر خدا کی نعمتوں سے بھرپور لطف اٹھا سکو۔ ساری کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے فرشتوں کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں اور جو ان کا حل ہے اس کو دولت مل رہی ہے گی۔ تو پھر اس بے چینی کو دور بھگائیے کہ یہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی بس اتنا کام کیجیے۔ اے اللہ میں نے تیرے احکام کی پیروی کی ہے جو میرے لیے بہتر ہے وہ مجھے عطا کر دے اور ایسے میں تو ناراض ہونا چاہیے نہ پھر بھی حق ملے تو غم میں خدا کو پکارنے کا جو مزہ ہے اور انسان خدا کو جتنا قریب محسوس کرتا ہے وہ قرب راحت میں میسر کہاں۔ اور سب سے اہم بات کہ خدا اپنے راسخ العقیدہ بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔

تو آئیے نئی زندگی سے بھرپور قہقہے کے ساتھ اپنی تمام پریشانیوں کو خدا کے سپرد کرتے ہیں کہ اس ساری وقتی بے چینی اور بے سکونی کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دو۔ راضی بہ رضا رہنا سیکھو پھر جینے میں جو مزہ آئے گا کسی مثال کہاں۔ پھر غم بھی اچھے لگنے لگیں گے محرومی کا بھی دکھ نہیں رہے گا۔ یہی واحد حل ہے خود کو پریشانیوں کی نذر مت کیجیے۔ ہمیشہ پرامید اور خوش رہیں۔ زندہ دلی سے جینا سیکھیے۔ کیونکہ

اے ابن آدم ایک تیری چاہت ہے
اور ایک میری چاہت ہے۔
اگر تو نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا اس کے۔

جو میری چاہت ہے

تو میں تمہیں بخش دوں گا جو تیری چاہت ہے۔

اور اگر تو نے نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے۔

تو میں تمہیں تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے۔

پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

اسی طرح: حضرت علی واصف کا ایک موصل ہے۔

"غم تمہاری خواہشات اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں تضاد کا نتیجہ ہے" "غم اس لیے ہیں کہ تم اللہ کی رضا پر تسلیم نہیں کرتے۔"

ہمارے حکمران بھی جو کر رہے ہیں اس سے اپنا دامن چھڑا نہ رہیں۔ خود ارادی سکوں اور اللہ پر ایمان کو کسی بھی قیمت پر کمزور نہ کریں یہی اندھیروں میں چراغ کا کام کرے گا۔ یہی لوٹے لوں کا آخری سہارا ہے۔ یہی ڈوبتی ناؤ کو کنارے پر لے جائے گا کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کشتی میں سوراخ کون کر رہا ہے بس کشتی کنارے لگنی چاہیے جو ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ اضطراب پیدا کر رہے ہیں وہ اپنا کام پورا کر کے بھاگ جائیں گے تو پھر سہارا کون دے گا؟ تو پھر کیوں نہ یہ کام ابھی سے جاری کر دیا جائے۔

"آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اور ہمارے ایمان کو پختگی کی حدود تک لے جائے (آمین) تاکہ ہم بھی پکار سکیں۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں، نہیں دانہ اسپند

(اقبال)

میوس بی جولی (انگلینڈ)

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

ذیل کے مضمون کے ترجمہ و ترتیب کا فریضہ ام اسعد نے انجام دیا ہے۔ یہ ماہنامہ "میثاق" لاہور کے شمارہ جولائی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔

ذیل میں بیان کی گئی خود نوشت ایک ایسی باعزم خاتون کی کہانی ہے جس کی پرورش گرجا گھر کے مذہبی ماحول میں ہوئی لیکن زندگی کا مقصد اس کے لیے ایک سربستہ راز ہی رہا۔ اس راز کو جاننے کے لیے اس نے کئی راستوں کی خاک چھانی لیکن منزل تو دور کی بات ہے نشان منزل تک پہنچنا بھی مشکل مرحلہ بن گیا۔ تاہم حق کی تلاش کا یہ سفر اس نے جاری رکھا حتیٰ کہ باری تعالیٰ کا حکم ہوا اور نور ہدایت کی شعاعیں ظلمتوں کی تہوں کو چیرتی ہوئی قلب بنت حوا پر اتر گئیں۔

اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور (البقرہ: ۲۵۷)

"اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے وہ انہیں نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف۔"

درحقیقت یہ اللہ ہی ہے جسے چاہتا ہے گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر اس کے باطن کو نور ہدایت سے منور کر دیتا ہے لیکن ہم جو پیدائشی مسلمان ہیں اس کیفیت سے بالکل ہی نابلد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے یہاں بیٹیوں کے جہیز کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے یا پھر کسی طاق یا الماری کی زینت بنا رہتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ عظیم کتاب ہے جو دل و نگاہ کے زاویے بدل دیتی ہے۔ کاش کہ ہم بھی قرآن کی تعلیم اور اس کی حقیقتوں کو سمجھ پاتے اور انہیں اپنے دل میں اتار لیتے تو رب کی رحمت پر یقین پختہ ہوتا۔ جب جبینیں خلوص دل کے ساتھ وحدہٗ لاشریک کے سامنے جھک جاتی ہیں تو انسان اس لڑی میں پرو دیا جاتا ہے جو بندے کو بندے سے جوڑ کر اسے کائنات سے جوڑ دیتی ہے۔

دیگر بچوں کی طرح میری پیدائش بھی جس ماحول میں ہوئی اس پر عیسائیت کا گہرا اثر تھا۔ والدین مجھے انگلیکن چرچ میں لے گئے جہاں مجھے بپتسمہ دیا گیا۔ جب میری عمر سکول جانے کی ہوئی تو مجھے گرجے میں واقع سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں ہمیں یسوع کی وہ کہانی بار بار ذہن

پیش کی گئی جو انجیل میں درج ہے۔ یسوع کی کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا اور میرا آدھا وقت گرجا گھر ہی میں گزرنے لگا جہاں نیم تاریک ماحول میں جلتی ہوئی شمعیں، صلیب پر لٹکے ہوئے یسوع کا مجسمہ اور کنواری مریم کی تراشیدہ مورتیاں عجیب سی پراسراریت پیدا کیے رکھتیں۔ بجز راہبوں کے لمبے لمبے چغے جنہیں وہ اپنی کمر کے گرد رسیوں سے باندھے ہوتے، ہاتھوں کے ستار سے ڈھلے ہوئے سر اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نظموں کو پڑھے جانے کی پس پردہ موسیقی اور دعائیہ انداز، یہ سب کچھ مجھے پراسرار سا لگتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میرے دل و دماغ پر مذہبیت پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور اس دوران بائبل سے بھی میری شناسائی زیادہ ہوتی چلی گئی۔

ایک تعلیمی ماحول جہاں ہر شے عیسائیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی یقیناً کافی سخت گیر قسم کا تھا، لیکن دوران تعلیم مجھے یہ موقع ضرور ملا کہ میں دیکھوں کہ میں جو کچھ پڑھتی ہوں اور جس پر میں یقین رکھتی ہوں، کیا عملی دنیا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ حقیقت کی تلاش نے مجھے آہستہ آہستہ اس نہج پر پہنچا دیا جہاں مجھے کامل یقین ہو چلا کہ میرے گرد جو بھی ہے وہ ذہنی تسکین مگر اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہت سے عملی تضادات نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ چنانچہ جب میں تعلیم سے فارغ ہوئی اس وقت تک میرا عیسائیت پر سے ایمان بالکل اٹھ چکا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک عیسائی تعلیمی ادارے سے فراغت کے وقت میں ایک اچھی عیسائی خاتون ہونے کے بجائے ملحد ہو چکی تھی۔

لیکن ان دنوں یہ دور ایک عبوری دور تھا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے قلب اور روح کا اطمینان مذہبی تعلیمات ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

لیکن کم از کم عیسائیت مجھے وہ اطمینان اور سکون قلب نہیں دے سکتی جس کی مجھے تلاش ہے چنانچہ میں نے دنیا کے دیگر مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کی ابتدا میں نے بدھ مت سے کی اور بہت ہی شوق کے ساتھ "کپل وستو" کے پیش کردہ "طریق ہشت گانہ" کا مطالعہ شروع کیا تا کہ زندگی کے کٹھن راستے کو سکون قلب کے ساتھ طے کیا جا سکے، لیکن جلد ہی مجھے یہ احساس ہو گیا

بدھ مت کے "طریقِ ہشت گانہ" کے مقاصد بظاہر تو بلند ہیں، لیکن حریت کے پیچھے جس جسمانی اور روحانی ضرورت ہوتی ہے بدھ مت اس سے بالکل تہی دست ہے۔

جہاں تک ہندو مت کا معاملہ ہے عیسائیت کے تین خداؤں کے مقابلے میں یہاں مجھے سینکڑوں خداؤں سے واسطہ پڑ گیا۔ ان میں بڑے دیوتا بھی تھے اور چھوٹے بھی، محدود اختیار والے خدا بھی تھے اور خبیث ارواح بھی۔ یہ جان کر میں جہالت کس قدر ترقی کر گئی تھی کہ انسانی اعضاء کی پوجا کو بھی جگہ دی گئی تھی۔ اس مذہب کا ادب سر تا پا قصوں اور داستانوں پر مبنی ہے اور ظاہر ہے کہ مہا بھارت (سانپوں کے قصے) اور رامائن (شیطانوں کے قصے) جیسی کتابیں ہیں جنہیں وقت گزاری کے لیے تو پڑھا جا سکتا ہے لیکن بطور ایمان قبول نہیں کیا جا سکتا۔

پھر میں نے یہودیت کے بارے میں بھی مطالعہ کیا۔ اگرچہ بائبل کے عہد نامہ قدیم سے رابطے کے باعث میں یہودیت سے تھوڑا بہت متعارف تھی تاہم مزید مطالعے سے خاص طور پر "تالمود" کی تعلیمات سے آگاہی کے بعد مجھے علم ہوا کہ یہودیت دراصل عصبیت، نفرت اور نسل پرستی کے فلسفے پر مبنی ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی تمدنی ترقی کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

ان مذاہب کے مطالعے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک تاریک رات میں گھنے جنگلوں کے درمیان کھو گئی ہوں اور راستے کے نشان کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ چرچ کی تعلیمات کا اثر تھا کہ میرے لاشعور میں اسلام کے خلاف نفرت اور عصبیت اس طرح گھر کیے بیٹھی تھی کہ تلاشِ حق کے سفر کے دوران مجھے یہ خیال ہی نہ آیا کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کی جائے۔

جب میں اس حالِ کرب و اذیت سے گزر رہی تھی تو میری ایک دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ تم روحانیت کی جانب کیوں رجوع نہیں کرتیں۔ وہ مجھے شہر سے باہر ساحلِ سمندر کے کنارے یا پھر کسی ایسی جگہ لے جاتی جہاں صرف ہوا کا شور یا پرندوں کی چہچہاہٹ ہوتی۔ اس نے مجھے تنفس کو قابو کرنے کے لیے کچھ مشقیں بتائیں لیکن میرا دل جلد ہی ان تمام تجربات سے اکتا گیا۔ حقیقی مذہب کی تلاش اب بھی میرا مقصد تھا۔

اسی دوران ایک مقامی اخبار میں یسوع کی الوہیت کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا۔ میں نے بائبل کے حوالے سے ایک جوابی مضمون تحریر کیا جس میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے بے شمار حوالہ جات سے یسوع کی الوہیت کے عقیدے پر کافی شدید تنقید کی گئی تھی۔ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے بہت سے خطوط موصول ہونا شروع ہو گئے، جن میں اس موضوع کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث کی جاتی۔ انہی خطوط میں مجھے ایک مسلمان کا خط موصول ہوا۔ جس میں اس نے تحریر کیا کہ آپ نے حضرت عیسیٰ کی الوہیت کو رد کر کے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے کو تسلیم کر لیا ہے اور آپ کے مسلمان ہونے میں صرف اتنا مختصر سا عمل باقی رہ گیا ہے جتنا کہ ایک کلمہ پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس خط نے تو گویا میری دنیا ہی بدل ڈالی اور میں نے مختلف لوگوں کے ساتھ اسلام کے بارے میں گفتگو اور آگاہی حاصل کرنے کا آغاز کر دیا۔ ہر گفتگو کے بعد میرے لاشعور میں بیٹھی ہوئی اسلام کے خلاف عصبیت دم توڑ دیتی اور بالآخر میں نے تسلیم کر لیا کہ صحرائے عرب کے ایک شخص نے جو اعلیٰ تعلیمات پیش کی ہیں اور جن آئین کو متعارف کرایا ہے، ہماری بیسویں صدی کی انتہائی ترقی یافتہ حکومتیں بھی ان آئین کا نعم البدل پیش نہیں کر سکتیں۔ میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ ہماری حکومتوں نے کافی تگ و دو کے بعد جو بہترین قوانین بنائے ہیں وہ اسلام نے چودہ سو سال پیشتر ہی متعارف کرا دیے تھے۔ اسلام کے مطالعے کے دوران میں برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے علاوہ ان لڑکیوں سے بھی ملتی رہی جنہوں نے عیسائیت کو خیرباد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن قلب کی وہ طمانیت جس کا میں خیال کرتی تھی، اب بھی مجھ سے کوسوں دور تھی۔ یہ لڑکیاں ہر طرح سے میری مشکلات دور کرنے میں مدد کرتیں۔ میں نے اسلام سے متعلق کئی کتب کا مطالعہ جاری رکھا۔ ان میں "دین اسلام" "محمد اور عیسیٰ" اور "عیسائیت کا جائزہ" جیسی کتب شامل تھیں۔ مؤخر الذکر کتاب پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ قدیم و یونانی مذاہب کے بیشتر عقائد اور رسومات آج بھی صرف نام کی معمولی تبدیلی کے بعد عیسائیت میں مستعمل ہیں۔

بہرحال زیر مطالعہ کتب کے علاوہ میں نے قرآن کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ شروع شروع

میں تو ایسا تھا جیسے کسی کتاب کے بعض ابواب محض سمجھنے کی خاطر دہرائے جاتے ہیں۔ مجھے دراصل یقین ہی نہ تھا کہ میں اس کتاب سے کچھ حاصل بھی کر رہی ہوں یا نہیں۔ لیکن قرآن جیسا کہ میں نے پایا صرف انہی کی راہنمائی کرتا ہے جو اتنا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ سب کچھ بہت ہی آہستگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن سب سے پہلے ہماری روح کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے اور جب قلبی کیفیت بدلنا شروع ہوتی ہے تو روح بھی بتدریج آلودگیوں سے پاک ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر ایسا وقت بھی آ جاتا ہے جب جسم اور روح یک جان و قالب ہو کر ایک مطہر آب رواں کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اب بڑا خوشگوار احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیات دراصل ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم محسوس تو کر سکتے ہیں بیان نہیں کر سکتے۔ ہمارے الفاظ میں وہ وسعت ہی نہیں کہ تطہیر قلب کے اس پاکیزہ عمل کو بیان کیا جا سکے۔

بہرحال قرآن کا مطالعہ میری عادت بن گیا۔ آفس کی مصروفیات اور دوسرے کاموں سے فراغت کے بعد سونے سے قبل ہر رات میں قرآن کا مطالعہ ضرور کرتی۔ نہ جانے کتنی ہی راتیں اس طرح گزر گئیں کہ اگر میں قرآن کو رکھ دینا چاہتی تو بھی ایسا نہ کر سکتی۔ جوں جوں قرآنی ذوق مجھ پر چھاتا گیا اس کی تعلیمات میری سمجھ میں آتی گئیں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوتی کہ اس قدر مکمل اور جامع رہنمائی سے مزین یہ کتاب ایک امی انسان کی معرفت کس طرح پیش کی گئی ہوگی۔ خود مسلموں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ محمد ﷺ کسی آسمانی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے یا کوئی مافوق الفطرت انسان تھے۔ قرآنی مطالعے سے مجھے یہ پتا چلا کہ جتنے بھی پیغمبر آئے بشمول محمد ﷺ تمام کے تمام انسان ہی تھے لیکن عام انسانوں سے وہ صرف اس قدر مختلف تھے کہ ایک تو معصوم تھے اور دوسرے یہ کہ ان پر باری تعالیٰ کی جانب سے وحی نازل ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم ہوا کہ نبی کریم ﷺ پر آنے والی وحی کوئی نئی بات نہ تھی۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم کے کئی حوالہ جات ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام جلیل القدر نبیوں پر وحی نازل ہوتی تھی حتیٰ کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب اناجیل کے متون سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئے ہوئے احکامات کی تعمیل میں تبلیغ کرتے تھے۔ اس کے باوجود یہ

بات میرے لیے ایک معمہ بنی رہی۔ اس ترقی یافتہ دور میں ایک بھی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کوئی کتاب تحریر کی ہو اور یہ دعویٰ کیا ہو کہ اس کی یہ کتاب بھی الہامی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے جب میں نے قرآن سے رجوع کیا تو مجھے علم ہوا کہ محمد ﷺ اللہ کی جانب سے مبعوث کردہ رسولوں میں آخری رسول ہیں، اور یہ بات بھی حقیقت ہے کہ نئے پیغمبر کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب اس کے پیش رو پیغمبر کی تعلیمات اور اس پر نازل کردہ الہامی تعلیمات میں تحریف کر دی گئی ہو۔

لیکن قرآن، جیسا کہ اس کے مصنف اللہ نے خود دعویٰ کیا ہے کہ "ہم ہی نے اس کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔" (حجر ۹) گزشتہ چودہ صدیوں سے اپنی اصل حالت میں موجود ہے، اور اس میں کسی ایک حرف کی تبدیلی یا تحریف بھی ریکارڈ نہیں کی جا سکی۔ ظاہر ہے کہ جب یہ الہامی تعلیمات اپنی اصل شکل میں بلا کسی تحریف و تغیر کے موجود ہیں تو کسی نئے نبی یا نئی کتاب کی ضرورت ہی کیونکر ہو سکتی ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور بات جو میرے مشاہدے میں آئی وہ یہ تھی کہ قرآن نے ان لوگوں کو جنہیں اس کتاب پر ذرا سا بھی شک ہے بڑے حسین طریقے سے اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو اس کتاب کے الہامی ہونے میں ذرا سا بھی شک وشبہ رکھتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اس طرح کی کوئی ایک سورت ہی تحریر کر کے دکھا دیں۔ (یونس ۳۸) تب میرا خیال تھا کہ آج کے عہد جدید میں جب سارا الفاظ کی تلاش کے لیے بہترین سے بہترین لغت موجود ہے، ہم محمد ﷺ کے زمانے کے مقابلے میں قرآنی ادب سے بہتر ادب تحریر کر سکتے ہیں اور پھر ایک چیلنج کے طور پر میں نے یہ کام شروع کیا۔ لیکن جب بھی قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتی الفاظ میرا ساتھ چھوڑ جاتے اور ذہن پر جیسے تاریکی سی چھا جاتی ہے۔ پھر میں یہ بات جان گئی کہ ایسا ادب تحریر کرنا جس میں انسان کے تمام مسائل کا حل موجود ہو کم از کم میرے لیے یہ ناممکن ہے۔ میرے دوست اور رشتہ دار جب مجھ سے ملنے آتے تو میرے کمرے میں مذہبی کتب دیکھ کر تعجب کا اظہار کرتے۔ چونکہ چرچ کے متعصبانہ رویے نے انہیں دین اسلام کا سخت دشمن بنا رکھا تھا لہٰذا اکثر مواقع پر وہ بحث کے دوران اسلام

پر نہایت رنگین قسم کے حملے کرے۔ مثلاً تعدد ازدواج کو ہی لے لیجئے۔ انہوں نے مجھے اس بات پر قائل کرنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کرلی۔ انسانی تمدن میں جو پہلی ترقی نظر آتی ہے وہ مغرب کے یک زوجگی فلسفے کی مرہون منت ہے، جب کہ اسلام ایک جاہلانہ دور کی معاشرتی خرابی "کثیر الازدواجیت" کو اب بھی سینے سے چمٹا رہا ہے۔

اس بات کا ذکر جب میں نے اپنی مسلمان دوست سے کیا تو اس نے اخبارات کے تراشوں اور خواتین کے مجلوں سے نکالے ہوئے مضامین میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ "آپ ان کو دیکھئے اور بتائیے۔ مغرب کو یک زوجیت پر جتنا فخر ہے اور اسے جتنا تہذیب یافتہ ہونے کی علامت گردانا جاتا ہے اس کی فی الحقیقت کیا صورت حال ہے اور برطانوی معاشرہ یک زوجیت پر کس حد تک عمل پیرا ہے؟ زنا کاری کے باعث ہمارے معاشرے کی اخلاقی اقدار جس تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہیں اور ناجائز بچوں کی بڑھتی ہوئی شرح نے خاندان کی اکائی کو تباہ کر ڈالا ہے۔ اس کا احساس ابھی تک ہمارے ارباب حکومت کو نہیں ہو سکا۔ ہماری نئی نسل والدین کی اخلاقی و معاشی تربیت کے بغیر فرسٹریشن کا شکار ہے اور وہ اپنے مذہب کا کامل تشخص اور ثقافتی جذبے کی تسکین کے لیے جرائم کو پناہ گاہ سمجھتی ہے۔ ڈرگز، کلب اور اختلاط ہمارے معاشرے میں ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ اسی طرح کی دیگر قباحتیں ہیں جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ چکی ہیں۔ ان قبیح برائیوں، خاص طور پر زنا کاری اور حرمت نسوانیت کے تحفظ کے لیے درحقیقت ہمارے پاس "کثیر زوجیت" کے سوا اور کوئی حل ہے ہی نہیں۔ میں تو بھی یہ دیکھ چکی تھی بالخصوص دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب کہ برطانوی معاشرے میں مردوں کی قلت کے بعد خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد تنہا رہنے پر مجبور ہوگئی تھی تو انہیں کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ملکی معیشت کو سہارا دینے اور سب سے بڑھ کر اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے برطانوی خواتین نے بڑی تیزی سے وہ پیشے اختیار کیے جہاں کام کر کے نہ صرف ان کی نسوانیت ختم ہوگئی بلکہ گھر میں سارا دن تنہا رہنے والے بچے بھی اخلاقی گراوٹ کا شکار

ہوگئے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت وہ تھی جب خواتین کی اچھی خاصی تعداد نے بھوک
مٹانے کے لیے عصمت فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ یہ حالات ان عورتوں کو ساری ہی زندگی
گزارنے کے لیے رلا دھکا چھوڑا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جو میری طرح کم و بیش ہر خاتون کے ذہن
میں شدہ ور کلبلاتا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ریڈیو پروگرام میں جس کا عنوان 'میں سر' تھا ایک
کنواری انگریز خاتون نے کہا تھا کہ مردوں کو کثیر ازدواجیت کا قانونی حق ہونا چاہیے۔ وہ خاتون
تو یہاں تک کہہ گئی کہ آبرومندانہ زندگی گزارنے کے لیے اسے کسی شادی شدہ مرد کی بیوی کی
قانونی شراکت میں رہنا بسر و چشم قبول ہے۔ اسلام کی 'کثیر ازدواجیت' کے بارے میں
عیسائیت نے جو زہر گھول رکھا ہے اس کی حقیقت اب مجھ پر منکشف ہوئی۔ اسلام نے کثیر
ازدواجیت لازمی قرار نہیں دیا ہے کہ ہر مرد پر ایک سے زیادہ شادیاں فرض ہیں لیکن ایک مکمل
دین میں ہر صورتحال اور رہنمائی کے مسائل سے متعلق جو ضروری ہو واقع ہونے چاہئیں۔ (جیسا
کہ ہماری یورپی معاشرے میں درپیش مسائل ہیں اور دین اسلام میں موجود ہیں ہدایات ہی
تمام انسانیت کا دین بن سکنے کا اہل ہوتا ہے۔

بہرحال اس طرح میں بتدریج اسلامی تعلیمات کو قبول کرتی گئی اور پھر ایک دن میں نے
اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسلام کو قبول
کرنے کے بعد میرے دل اور میری روح کو وہ طمانیت حاصل ہوگئی جس کی تلاش میں میں عمر بھر بھٹکتی
رہی۔ یہ اطمینان اس لیے بھی تھا کہ میں نے محض جذبات کی رو میں آکر اسلام قبول نہیں کیا تھا
بلکہ اسلام سے متعارف ہونے کے دو برس بعد تک میرے اندر حقائق کو تسلیم کرنے کے لیے
مشاہدے اور دلائل کی جنگ جاری رہی۔ اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے بعد ہی ایسا
ممکن ہو سکا کہ ظلمتوں میں گمشدہ راہی کو اپنی اصل منزل کا نشان مل گیا۔

پہلا مولود

مدینہ منورہ کی گلیوں میں غیر معمولی رش تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ نبی ﷺ کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیتا ہوا مسجد نبوی کی طرف گامزن تھا۔ ان میں پیش پیش سیدنا ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کو تباہ و برباد کرے ان کی تمام خواہشات ناکام ہو گئیں، وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آج غیر معمولی طور پر خوش تھے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے کیونکہ آج وہ پہلی مرتبہ نانا بنے تھے۔ مسجد نبوی میں پہنچے تو اللہ کے رسول ﷺ کا چہرہ مبارک بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ادھر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے نومولود کو اللہ کے رسول ﷺ کی گود مبارک میں ڈال دیا۔

آپ ﷺ نے کھجور منگوائی، اپنے دہن مبارک میں اس کو چبایا اور پھر بچے کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈال دیا۔ اور اس بچے کا نام عبداللہ رکھا۔ اس طرح اس بچے کے پیٹ میں سب سے پہلے جو چیز داخل ہوئی وہ آپ ﷺ کا لعاب مبارک تھا۔ یوں تو تمام بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر اس بچے کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل تھی کہ ہجرت کے بعد یہ پہلا صحیح سلامت مسلمان بچہ پیدا ہوا تھا۔

جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو یہودیوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ ان کے کاہنوں نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور اب ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوگا۔ اور اتفاق سے ہوا بھی یہی کہ پہلے تو بچہ پیدا ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو پیدا ہوتے ہی وفات پا گیا۔ اس طرح یہودیوں کو چہ میگوئیاں کرنے کا خوب موقع مل گیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ہجرت کی مشقت برداشت کرتے ہوئے مکہ سے قبا پہنچیں، ان کے ہاں ولادت متوقع تھی، چنانچہ قبا میں انہوں نے ایک خوبصورت سے بچے کو جنم دیا۔ اس بچے کی پیدائش پر غیر معمولی خوشی منائی گئی۔ اللہ اکبر کے نعرے لگے اور یہ نعرہ اس قدر زور سے لگایا گیا کہ مدینہ گونج اٹھا، کیونکہ یہودیوں کا پروپیگنڈہ ناکام ہو چکا تھا۔

آیئے ہم ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے اس بچے کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں۔ اس کا نام

نامی اسم گرامی عبداللہ ہے۔ نسب نامہ یہ ہے

عبداللہ بن زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی۔ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہؓ کے والد حضرت زبیر بن عوامؓ کی پھوپھی تھیں اور رسول اکرم ﷺ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب حضرت زبیر بن عوامؓ کی والدہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی دادی تھیں جو مسلمین اولین میں شامل تھیں اور بہت ہی بہادر خاتون تھیں، یہ شاعری بھی کیا کرتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھیں، وہ قدیم الاسلام اور مبشرات بالجنۃ میں سے تھیں۔ سفر ہجرت میں ان کا کردار کسی سے مخفی نہیں۔ ان کی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نانا حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے، جو انبیاء کے بعد امت میں سب سے افضل ترین شخصیت ہیں۔ اتنا اچھا حسب و نسب بہت کم ہی کسی کو میسر ہے تو گویا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، والد اور والدہ دونوں ہی کی جانب سے نجیب اور شریف النسب تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان سے اتنی زیادہ محبت کیا کرتی تھیں کہ جب وہ دنیا میں آئے تو انہیں اپنی بہن سے مانگ لیا اور پھر ان کی پرورش اور تربیت خود کی اور اللہ کے رسول ﷺ کے کہنے پر اپنے آپ کو ام عبداللہ کہلواتی تھیں اور یہ عبداللہ یہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے۔ ذہانت، دانائی، خطابت، حاضر جوابی، نیکی، تقویٰ، تیر اندازی، تلوار زنی اور شجاعت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

عثمان بن طلحہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا تین چیزوں میں کوئی مقابل نہ تھا شجاعت میں، عبادت میں اور بلاغت میں۔ غضب کے خطیب تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ انکی پہلی غذا اللہ کے رسول ﷺ کا لعاب دہن تھا۔

حاضر دماغی اس قدر کہ ایک مرتبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، وہاں سے حضرت عمر فاروقؓ کا گزر ہوا۔ دوسرے بچوں نے دیکھا تو فوراً بھاگ کھڑے ہوئے مگر یہ اپنی جگہ پر کھڑے

رہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم دوسرے بچوں کی طرح کیوں نہیں بھاگے؟ تو عبداللہؓ نے جواب دیا میں کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا کہ آپ سے ڈر جاؤں اور راستہ بھی تنگ نہیں ہے کہ آپ کے لیے راستہ چھوڑ کر ہٹ جاؤں۔

ابھی بچے ہی تھے کہ (ایک روایت کے مطابق اپنے والد محترم کے کہنے پر) مدینے کے بچوں کو اکٹھا کیا اور کہنے لگے کہ جس طرح بڑے لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کرتے ہیں، ہم بچے کیوں نہ کریں؟ چنانچہ وہ دیگر بچوں کی قیادت کرتے ہوئے مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ انہوں نے کہا اللہ کے رسولؐ! ہم آپ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ دوسرے بچے تو ٹھٹک گئے اور یہ کھڑے رہے۔ آپ نے فرمایا "اپنا ہاتھ" آگے بڑھاؤ۔ چنانچہ سب سے پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے بڑی محبت اور پیار سے ان کو تھپکی سے نوازا۔ ارشاد ہوا: "انت ابن ابیک" اس کا سادہ اور لفظی ترجمہ بنتا ہے کہ "تو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ تمہارے اندر اپنے باپ کی صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اور باپ بھی کون، جو اللہ کے رسول ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے، حواری رسول اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔ حضرت عبداللہؓ کا لقب حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) رکھا گیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے بے شمار واقعات ہیں۔ مگر ان کی قیادت کی صلاحیت اس وقت ظاہر ہوئی جب ان کو حضرت عثمان بن عفانؓ نے لشکر کے ایک دستے کا کمانڈر بنا کر افریقہ بھیجا تھا۔ لشکر کی قیادت حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کر رہے تھے۔

ہر روز صبح سویرے لڑائی ہوتی، دونوں فوجیں آمنے سامنے آتیں، مبارزت طلب کی جاتی اور دوپہر تک لڑائی ہوتی رہتی۔ دونوں طرف سے فوجی تھک کر واپس چلے جاتے تو لڑائی اگلے دن کے لیے ملتوی کر دی جاتی اور اگلے دن پھر از سر نو تازہ دم ہو کر فوجی آمنے سامنے کھڑے ہوتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت ۲۷ سال تھی۔ سپہ سالار کے خیمے میں فوجی قیادت

کا اجتماع ہو رہا ہے، ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کی باری آئی تو کہا میں آپ کی حکمت عملی سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ آپ تھوڑی لڑائی کیوں کرتے ہیں؟ پوری رات لڑائی ہونی چاہیے۔

ان کو جواب ملا سپاہی تھک جاتے ہیں، ان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے

عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا نہیں ہرگز نہیں دشمن کو تھکنے دیں، اس پر پوری لڑائی ہونی چاہیے۔

ان کو جواب ملا سپاہی تھک جاتے ہیں، ان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں ہرگز نہیں دشمن کو تھکنے دیں، ان پر پورا دن حملے کرتے رہیں تاکہ ان کو شکست فاش سے دوچار کیا جا سکے۔

سپہ سالار نے پوچھا: آپ کی کیا تدبیر ہے؟

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا فوج کے دو حصے کیے جائیں۔ ایک حصہ صبح سویرے لڑائی شروع کرے اور دوپہر تک لڑتا رہے، دوسرا حصہ اس دوران آرام کرتا رہے۔ دوپہر کے وقت غیر محسوس طریقے سے تازہ دم سپاہی آگے بڑھیں اور تھکے ہوئے سپاہی واپس آجائیں۔ اس طرح ایک ہی دن میں لڑائی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

سالار اعلیٰ نے مان حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تجویز دی۔ اگلے دن ان کی حکمت عملی کے مطابق جنگ شروع ہوئی۔ دشمن دوپہر کے وقت واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک تازہ دم دستہ آگے بڑھا اور دشمن کو تہ تیغ کر کے رکھ دیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نہایت جری، بہادر اور نڈر تھے۔ بے حد قوی جسم کے مالک تھے اور ان کا جب سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے سینگی لگوائی، خون ایک پیالے میں جمع تھا عبداللہ بن زبیرؓ پاس کھڑے تھے آپ ﷺ نے فرمایا عبداللہ اس خون کو باہر ایسی جگہ گرا دو جہاں کوئی اس کو دیکھ نہ پائے۔

انہوں نے پیالہ لیا، گھر سے باہر آئے، ہاتھ میں پیالہ ہے اور سوچ رہے ہیں یہ اللہ کے رسول کا مقدس خون ہے۔ اس کو زمین پر گرا دوں؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! اور پھر اچانک ہی

انہوں نے ایک عجیب فیصلہ کیا، پیالے کو منہ سے لگایا اور پی گئے۔ واپس آئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا عبداللہ! خون کو کہاں گرایا؟

عرض کیا۔ اللہ کے رسول! ایک ایسی جگہ جہاں اس کو اللہ کے علاوہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ کیا تم نے اس کو پی لیا ہے۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا جس کا خون میرے خون سے مل گیا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہو گئی۔

اب جس کے خون میں اللہ کے رسول ﷺ کا خون مل گیا ہو، اس کی بہادری، دلیری اور شجاعت کے کیا کہنے۔ اور اس کا مظاہرہ انہوں نے افریقہ میں اس طرح کیا۔ جنگ سبیطلہ میں عیسائیوں کا ٹڈی دل لشکر ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں تھا اور ان کے مقابلے میں مسلمان محض بیس ہزار تھے۔ دشمن کی قیادت بادشاہ جرجیر کر رہا تھا۔ مقابلہ شروع ہوا، عددی لحاظ سے دشمن بہت طاقتور تھا۔۔۔۔۔۔ دونوں طرف سے بہادر میدان میں ہیں۔۔۔۔ نیزے، تلواریں، تیر، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔۔۔۔۔۔ دشمن کی فوج کو جوش دلانے والا بادشاہ جرجیر تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اگر اس کا خاتمہ ہو جائے تو فوج کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ سپہ سالار عبداللہ بن سعدؓ کے پاس گئے۔ اپنا منصوبہ بتایا اور کہا مجھے چند باہمت اور موت پر بیعت کیے ہوئے نوجوان درکار ہیں جو میرے ساتھ ہوں، تاکہ میں بادشاہ کو قتل کرسکوں۔

بظاہر منصوبہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھے، دشمن کے فوجیوں نے سمجھا کہ یہ صلح کے لیے ان کے بادشاہ کے پاس جا رہے ہیں اور وہ راستہ چھوڑتے گئے۔

ادھر بادشاہ جرجیر گھوڑے پر سوار لونڈیوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ دو لونڈیاں مور چھل سے پنکھا کر رہی تھیں کہ اچانک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سامنے آ گئے۔ بادشاہ کو اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی، گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ مگر ادھر مقابلے میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے نیزہ اٹھایا جو پیچھے لگا۔ وہ نیچے گرا اور انہوں نے پلک جھپکنے میں اس کی گردن کاٹ کر نیزے پر چڑھا دی۔ اونچی آواز سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ادھر انہوں نے دشمن پر دھاوا بول دیا۔ اپنے بادشاہ

کے سر پر ٹوٹ پڑے، یہ دیکھ کر دشمن کے حوصلے پست ہو گئے اور عبداللہ کے شیروں کے ہاتھوں

سیرت نگاروں نے جرجیر بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے لڑائی سے پہلے اعلان یہ کیا تھا:

"جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار یعنی عبداللہ بن سعد کو قتل کر کے اس کا سر لائے گا، میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا اور ایک لاکھ دینار انعام میں دوں گا۔"

اس اعلان کے بعد عبداللہ بن سعدؓ کی حفاظت کا خصوصی انتظام تھا۔ مگر ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے زرخیز ذہن نے یہ مشورہ دیا کہ فوج میں اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص جرجیر کا سر لائے گا اس کا نکاح جرجیر کی بیٹی سے کر دیا جائے گا اور انعام میں ایک لاکھ دینار دیے جائیں گے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ جرجیر کے قتل کے بعد سپہ سالار نے اپنے وعدے کو پورا کرنا چاہا مگر عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا میں نے جہاد اللہ کی رضا کے لیے کیا تھا، دنیاوی زن اور مال و متاع مجھے درکار نہیں۔

وہ فتح افریقہ کے علاوہ اندلس اور قسطنطنیہ کی فتوحات میں بھی شامل رہے اور کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

پھر تاریخ نے ایک دن ایسا بھی دیکھا کہ یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی خلیفہ بنا۔ وہ ۱۸ سال کی عمر کا کمزور اور نوعمر لڑکا تھا اور جلد ہی بغیر کسی کو خلیفہ مقرر کیے فوت ہو گیا۔ اب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لیے میدان خالی تھا۔ مکہ کے لوگوں نے بیعت کی تو اہل حجاز نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔ ادھر جب مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کے باشندگان نے بھی اطاعت میں سر جھکا دیے۔ انہوں نے سرکاری عہدوں سے امویوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے وفادار ساتھی مقرر کرتے گئے

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت زیادہ دیر چل نکلی۔ شام پر بنو امیہ کی حکومت تھی۔ انہوں نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوششیں شروع کیں۔ پھر اہل مصر کو ساتھ ملایا اور عراق پر چڑھ دوڑے۔ ادھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی مصعب کی جگہ اپنے بیٹے حمزہ کو والی عراق بنا دیا۔ فریقین میں جنگ ہوئی۔ اموی غالب رہے اور حضرت مصعب شہید

سو گئے۔ آہستہ آہستہ حجاز کو چھوڑ کر باقی علاقوں پر امویوں نے اپنا اقتدار مضبوط کر لیا اور پھر مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے لیے ۷۲ ہجری میں حجاج بن یوسف ایک بڑی فوج کے ساتھ آیا۔ اس نے حرص اور لالچ کے علاوہ ڈرانے دھمکانے سے بھی کام چلایا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی حجاج سے آہستہ آہستہ ملتے چلے گئے۔ پھر کعبۃ اللہ کو منجنیق سے نشانہ بنایا گیا۔ حضرت عبداللہ کو اطاعت کے لیے مجبور کیا گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ۹۲ سال کی تھیں، بینائی ختم ہو چکی تھی۔ آپ ان سے مشورے کے لیے گئے تو انہوں نے جو جواب دیا وہ تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا گیا۔ ابن زبیر نے عرض کیا: اماں جان! میرے رشتہ داروں اور عزیزوں نے میرے ساتھ بے وفائی کی، مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب چند ساتھی بچے ہیں، شکست واضح ہے، کیا کروں؟

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے جواب فرمایا: میرے عزیز بیٹے! اگر تم اللہ کو راضی کرنے کے لیے لڑ رہے تھے اور سمجھتے ہو کہ تم حق پر ہو تو پھر اپنے شہید ساتھیوں سے جا ملو اور دشمن کے سامنے سر نہ جھکانا اور اگر تم دنیا کے لیے یہ لڑائی لڑ رہے تھے تو تم جیسا غلط شخص کوئی نہیں کہ اپنے رفقاء کو اپنے سمیت ناحق مروا دیا اور اگر تم کہو کہ میں حق پر تھا مگر ساتھیوں کے شہید ہونے اور چھوڑنے کی وجہ سے کمزور ہو گیا لہٰذا اپنے موقف سے ہٹ رہا ہوں تو یہ اہل دین اور آزاد لوگوں کا شیوہ نہیں ہے۔ ایسی زندگی سے موت کو گلے لگانا بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ اپنی ماں کے گلے لگ گئے، ان کا ہاتھ چوما اور عرض کیا: اماں جان! میری موت پر صبر کرنا۔ میں نے جان بوجھ کر کبھی منکر اور فحش کام نہیں کیے۔

میں نے کسی مسلمان پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ کسی ذمی کو قتل کیا ہے۔ ہمیشہ اللہ کے حقوق اور واجبات ادا کیے ہیں۔

دعائیں لے کر ماں سے رخصت ہوئے اور تمام ترغیب و ترہیب ٹھکراتے ہوئے ۱۳ جمادی الاولیٰ ۷۳ ہجری کو خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔ حجاج بن یوسف کے حکم سے نعش مبارک سولی پر چڑھا دیا گیا۔ بوقت شہادت عمر مبارک ۷۲ سال تھی۔ رضی اللہ عنہ۔ (بشکریہ مدرسہ دار الحسنات)

انسانی مسئلہ

(علامہ عنایت خان المشرقیؒ)

انسانی پیمائشوں کی غیر فطری اکائیاں

انسان کی خود ساختہ جیومیٹری اور ریاضی میں ایک بہت بنیادی اور دور رس نقص یہ ہے کہ ان کی بنیاد منصب العینی یا میکانیکی حالت پر ہے جس کا وجود فطرت میں نہیں۔ اس نقص نے مادے کے متعلق ہمارے سارے علم کو منصب العینی اور میکانیکی بنا دیا ہے اور جن لکیروں پر یہ علم ہزاروں سال سے چل رہا ہے وہ لکیریں انسان کو فطرت کی اصلی کارگزاری کا مدرک نہیں ہونے دیتیں جب تک مشاہدہ فطرت کے متعلق تمام نقطہ نظر بنیادی طور پر نہ بدل دیا جائے۔ ذیل کے اظہارات اس نقطہ کو واضح کر دیں گے۔

مشینیں انسان کی غیر فطری تخلیق ہیں

ہم نے جیومیٹری (یعنی پیمائش زمین) کو نقطہ، خط مستقیم اور دائرہ کی بنیادوں پر شروع کیا حالانکہ یہ تینوں حقیقت میں صحیفہ فطرت میں موجود نہیں۔ فطرت کی کوئی شے بھی مشابہت میں جیومیٹری کی ان شکلوں سے مشابہت نہیں رکھتی، نہ فطرت نے ان کو ان بنیادوں پر تعمیر کیا ہے۔ یہ بنیادیں انسانی (بلکہ یونانی) ذہن کے محبوب منصب العین تھے چونکہ یونانی لوگ اپنے بتوں کے تصور میں حد سے زیادہ منصب العینی واقع ہوئے تھے۔ "سطحوں کے علم" کی ان غیر فطری بنیادوں نے، (یہ کوئی اس کو "سطحی علم" ہی کا نام دے!) علم کو جر ثقیل اور علم رفتار (ڈائنمکس) کے ذریعے سے مشینوں تک پہنچایا ہے جو نقطوں پر گھومتی ہیں، دائروں اور سیدھے خطوں پر چلتی ہیں اور فطرت کی کسی حرکت کرنے والی جاندار شے سے اس قدر غیر مشابہ ہیں کہ انسان کے متعلق یکسر جھوٹے خلاق ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس بنا پر فطرت کے نقطہ نظر سے تمام میکانیکی علم ایک مصنوعی شے ہے جو انسان کو صرف اس کے موجودہ اعضاء کو حرکت دینے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس طرح کا میکانیکی علم انسان کو صرف ان جگہوں پر لے جا سکتا ہے جہاں اس کے جسمانی اعضاء جا سکتے ہوں۔ اس سے

زیادہ نہیں تھیں۔ برق، روشنی اور اصوات شعاع کے علوم نے علم جر ثقیل کی مدد انسان کے سننے دیکھنے بلکہ محسوس کرنے میں بھی ضرور کی ہے لیکن وہ انسان کے موجودہ جسمانی اعضا کو چشم زدن میں سو ہزاروں میل کے آسمانی فاصلوں تک نقل مکانی کرنے کے ناقابل ہیں۔ اس بنا پر اگر موجودہ علم جر ثقیل کم وزن رکھتا ہو تو برق سے بھی زیادہ طاقتور بلکہ نقل مکانی کرنے کے قابل بنانے والا ذریعہ درکار ہے جو انسان سے آسمانی ... پر قبضہ کرانے میں مدد دے۔ ہر مادے کے متعلق ایک فطری حد اخیال موجود ہے کہ وہ ایک خاص رفتار سے زیادہ کا متحمل بھی نہیں ہوتا۔ الغرض انسان یہ مشینیں ایک نہایت محدود دائرے کے اندر گھومنے کے غرض سے بنا رہا ہے اور جو کچھ اب تک بنا چکا ہے اس سے کائنات کا مسخر ہو جانا ناممکن ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ زمین سے باہر ان رقبوں کا جن پر انسان کو قبضہ کرنا ہے مطالبہ یہ ہے کہ انسان کے پاس بجائے نقل و حرکت کے ایسے سامان موجود ہوں جو اس کو ایک ثانیہ میں آپ ورا پ سیل منتقل کر سکیں بلکہ اس کا شعور علم و خبر کی انتہائی بلندی تک پہنچنے کے روحانی کوششوں کے ذریعے سے موجودہ غیر فطری مشینوں سے زیادہ فطری مشینوں پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کرنے کے بعد موجودہ گوشت پوست اور حرص کو چھوڑ کر صرف روحانی شکل اختیار کرنی ہوگی اور پھر اس کو اور بھی فطرت کے خلاف حرکت ثابت کرنا ہوگا۔ (حال کے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے والے کوہ پیماؤں کی مانند جن میں سینکڑوں کو اپنی زندگیوں اور اعضا سے ہاتھ دھونے پڑے) کرنے پڑیں گے۔

قدرت کے علم حساب کی مصطلحات انسان کی بنائی ہوئی مساواتوں سے مختلف ہیں

علم حساب جو ہم نے انسان کے بتائے ہوئے ہندسوں سے شروع کیا پھر وہاں سے جبر و مقابلہ کی علامتوں اور اس کی مساواتوں تک چلے گئے۔ یہ ایک طرح معلوم رہتا ہے کہ قدرتی قوانین ان مساواتوں کے مطابق بنائے گئے تھے اور وہ مجید الکل شعور مطلق جس نے کائنات کو پیدا کیا اس فطری قوانین کے مسئلوں کو حل کرتے وقت سلیٹ اور پنسل ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ نظریہ اضافت نے پہلے ہی واضح کر دیا ہے۔ اب انسان کی بنائی ہوئی مساواتوں میں جوں جوں انسانی علم میں اضافہ ہوتا جائے گا ترمیم ہوتی جائے گی لیکن آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی

صداقت کا بھی ناقابلِ انکار ثبوت یہاں موجود ہے؟ گزری چیزوں یا گھڑیال کے ذریعے کی جنبش سے ہماری پیمائش کی اکائیاں تو پہلے ہی غلط اور غیر حقیقی ثابت ہو چکی ہیں تو قوانینِ فطرت کے متعلق غیر حقیقی اور مبہم حسابی فارمولوں پر ہم پہنچے ہیں ان میں ایک صریح شاہد اس امر کا ہے کہ ہم نے ان کی دریافت کر کے قدرت کو مات دی ہے بلکہ قدرت خوشی کے عالم میں شکر گزار ہے کہ انسان نے ان کو معلوم کر لیا ہے اس طرح کا انسان اپنی تخلیق آپ کر رہا ہے اور لے دے کر اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں تو یہ ہے کہ انسان ابھی تک فطرت کے قوانین کو فطرت ہی کی زبان اور اصطلاح میں دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے بلکہ یہ مادی پیمائش کی فطری اکائیوں وغیرہ سے قطعی بے خبر ہے۔

انسان کا علم کیمیا صرف بے جان مادے کا جوڑ توڑ ہے

ہمارا علم کیمیا صرف بے جان مادے کا علم کیمیا ہے اس نے چند عمدہ اور مفید مرکبات یا تجزیری مجز سے تیار کیے ہیں لیکن زندگی کے مسئلے کا حل ان دریافتوں سے نہیں ہو سکا۔ سائنسدان شرم کا مارا زاویے ہی سے پیچھے رہا ہے جب وہ مکمل سکتے میں ایک انڈے کو دیکھتا ہے کہ چوزہ خود بخود چھپ کر چونچ مار رہا ہے اور آنکھ کے انڈے کے اندر جو تغیر رونما ہوتا رہا ہے اس کے سمجھنے سے پہلے تشکیل کی توجیہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ جب ایک چھوٹا سا بیج خود ہی ایک درخت بنتا جاتا ہے اور اس کے اندر جو تغیر رونما ہوتا رہتا ہے اس کی توجیہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی حتیٰ کہ وہ اس تقاضے کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکتا جو بیج کو درخت بنا رہا ہے، زندگی کے اندر خود بخود احساسات کیوں ہے ایک جواب دہ کر دینے والا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ زندگی ضرور ابتدائی طور پر بے جان مادے سے ہی پیدا ہوئی ہوگی۔ یہ "درمیانی کڑی" جب مل گئی اور اس کی خاطر خواہ توجیہ بھی مل گئی تو یہ انکشاف شاید صحیح علم کا پہلا طلوع ہوگا جب کہ انسان کی بنائی ہوئی جیومیٹری اور ریاضی اور کیمیا سب کے سب ماضی کے قصے بن جائیں گے اور انسان کو فطرت، فطرت کی زبان میں اور فطرت کی اکائیوں میں سمجھ آنے لگے گی۔ یہ ایک تعجب انگیز طور پر حیرت انگیز بات ہے کہ انسان جو بذاتِ خود زندگی کی احساسات بدرجہ کمال رکھتا ہے، اس

انسیابیت کی توجیہ بھی نہیں کرسکتا بلکہ اس کو محسوس بھی نہیں کرتا جو اس کے اپنے جسم کے باعث کو خود بخود بڑھاتی رہتی ہے جو اس کے اپنے جسم کے زخموں کو خود بخود مندمل کرتی ہے جو اس کے اپنے معدے میں خوراک کو خود بخود ہضم کرتی ہے، جو اس کے اپنے کانوں سے سننے، آنکھوں سے دیکھنے اور ذہن سے سوچنے کا کام لیتی ہے۔ اگر بیجان مادے کے ارتقا سے ہی یہ خاصیتیں اس "جادو کے زور" سے پیدا ہوتی ہیں تو یقیناً وہ طلسم ہمیں ان کیمیائی فارمولوں سے نہیں مل سکتا جو ہم نے معلوم کر کے خود شعور پر ترتیب دے رکھے ہیں بلکہ وہ ہمیں اس "روشنی" کے منبع سے رابطہ اور موجودہ قطعیت حاصل کرنے سے ملے گا جو ایک بجھی ہوئی شمع کو یکدم جلا دیتی ہے اور اس دوامی جہت سے شمع کو جلائے رکھتی ہے۔ یہ "نور" ہمیں انسانی ذہن اور شعور کی فطرت کے طریقہ عمل کے متعلق ابتدائی طور پر جانکاری بھی کے بعد ہی مل سکے گا اور وہ بھی اس وقت کہ زندگی کے عظیم الشان راز میں مسلسل غور و فکر کے بعد کوئی نیا طریقہ تلاش مل جائے جو موجودہ طریقوں سے مختلف ہو۔ زندگی کا مسئلہ دراصل فطرت کے اس راز کو دریافت کرنے کا مسئلہ ہے جو انڈے کو ٹوٹنے والے چوزے کی اکائی، انسانی نطفے کو ٹوٹنے والے بچے کی اکائی اور بیج کو اُگنے والے درخت کی اکائی بنا دیتا ہے۔

انسانی اعضا میں ماحول کی تبدیلی کے باعث تبدیلیاں

انسانی زندگی کے امکانات کے متعلق ایک اور لیکن مختلف قسم کا اشارہ حال ہی میں اس زمین کے بعض ان قطعوں کی دریافت کے دوران میں حاصل ہوا ہے جو زمین پر واقع ہیں یا اس کے اوپر ہیں۔ زمین کے قطبی حصوں، ماؤنٹ ایورسٹ کے اوپر کے فضائی علاقوں میں انسان اپنے جسمانی اعضا کے ان علاقوں اور آب و ہواؤں میں مناسبت کے متعلق بعض نتائج پر پہنچا ہے۔ مثلاً معلوم ہوا ہے کہ صرف خاص بناوٹ اور خاص معیار صحت کے انسان ہی ان علاقوں کی آب و ہواؤں کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ نیز انسان کے انہی اعضا کو آب و ہوا سے نقصان پہنچتا ہے جن کے بغیر انسان زندہ رہ سکتا ہے مثلاً ہاتھ پاؤں، انگلیاں وغیرہ اور انسان کے اعضائے شریفہ مثلاً دماغ، آنکھ، کان، دل اور جگر وغیرہ پر کم سے کم اثر ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم

ہوتی ہے یہ جنسی خواہش (جو غالباً انسان کا ایک اور غیر ضروری ورثہ ہے) ان چٹانوں کی پچھلی منزلوں میں ہی غائب ہو جاتی ہے (یعنی زمین سے صرف چار میل اوپر کے فاصلے پر)، علاوہ ازیں خوراک جو انسان کا جسم قائم رکھتی ہے رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں زیادہ کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ بھی۔ چڑھنے والوں کے ذاتی خیالات اور قوتوں میں نہایت نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ انقلابات اگر ان کا مشاہدہ ہو تو محقق ہو جائے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسانی اعضا و جوارح میں پیشتر اس کے کہ انسان زمین سے باہر کے آسمانی کروں پر قبضہ کرے خاص تبدیلیوں کا واقع ہونا لازمی ہے۔

انسان کے اعلیٰ ترین مخلوق میں ارتقا کا طریق عمل

سائنسدان کی حکومت کے دوران جب کہ تمام دنیا کے انسان اجتماعی ضرورت سے مجبور ہو کر تسخیر کائنات کے مسئلے کے حل میں یکسوئی سے لگے ہوں گے اس طرح کے مسئلے لازمی طور پر انسان کے سامنے پیش ہوں گے اور وہ بھی اس وقت جب فطرت کا علم حاصل کرنے کے وسائل اس تکمیل کے ہر مرحلے پر کشمکش حیات کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر بہتر صورتوں میں ہونے پر لگے ہوں گے بہت ممکن ہے کہ آسمانی علاقوں میں انسان کی رسائی کی تمام کوششیں اس نتیجے پر پہنچائیں کہ انسان کے موجودہ اعضا قالب ورنہ کافی نہیں بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور شعور کو اگر تمام کائنات پر قبضہ کر کے اس پر حاوی ہونا ہے تو اس کو کثیر موجودہ اعضا مثلاً ہاتھ اور پاؤں سے عاری ہونا چاہئے جن کا غالباً فطرت کے نزدیک ابتدائی مقصد صرف محدود دائروں میں اور فرصت کے وقتوں میں پھیلنے کے لئے ملے تھے یہ جمال پسند ناک، دہن وغیرہ جو انسان کی سفلی خواہشوں کو پورا کرنے کی غرض سے دیئے گئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ سائنسدان کی تمام روئے زمین پر حکومت کی وجہ سے اگر تسخیر کائنات کے مجموعی نصب العین نے پوری انسانی نسل کو کسی ہمہ گیر اور طاقت سے متحرک کر دیا تو یہ اعضائی تبدیلیاں عام طور پر واقع ہو سکتی ہیں اور ارتقا کے لئے مجموعی انسانی کوشش ہی انسان کو آج کی ادنیٰ خواہشوں اور سفلی محرکوں سے مبرا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ

انسان کو نفسیاتی طور پر اس عظیم الشان کام کو پیش نظر رکھ کر تیار کرنے کے لئے بھی ایک عالمگیر اور جہان انگیز کوشش درکار ہوگی۔

تسخیر کائنات کے لئے مطلق علم وخبر اور علی الاطلاق حاضر باشی لازمی خاصیتیں ہیں

ایک ایسے شعور کے لئے جو کل کائنات کو مسخر کرنے کا اہل ہے لازمی ہے کہ وہ مطلق علم وخبر اور علی الاطلاق حاضر وناظر ہونے کی خاصیتیں رکھتا ہو۔ کائنات کی ساخت بالعموم ہی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ گوشت پوشت اور خون والی زندگی کو یہ خصوصیات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اگر کائنات کے دوسرے حصوں میں باشعور زندگیاں قیام پذیر ہیں لیکن ایک ایسی باشعور زندگی کے لئے جو تمام کائنات میں ہر جگہ رہنے کے قابل ہو، تمام آسمانی کروں کے حالات زندگی کے "ذو اضعاف اقل" کا ہونا ضروری ہے اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ باشعور زندگی "روح" کی شکل میں تبدیل ہو جائے جس پر کسی آسمانی حالات یا آب وہوا کا مخالف اثر نہ ہو لیکن وہ بذات خود مطلق علم وخبر کی مالک مکمل طور پر حاوی اور محیط الکل ہو۔ مستقبل کے علمی نوع البشر کا نصب العین اس بنا پر یہ ہوگا کہ وہ اس کمال کی حد تک اپنے دماغ اور اعضا کی کل نوعی جدوجہد سے پہنچے جس کا نتیجہ اس کے موجودہ جسمانی اعضا میں انتہائی تبدیلیوں کا واقع ہونا ہو۔

انسانی تاریخ میں ایک واقعہ شاید اس نکتے کو واضح کر دے۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس کی امریکہ کی دریافت کے ڈیڑھ سو سال بعد انسان نے امریکہ کی طرف ہجرت اختیار کی جس کو اب قریباً تین سو برس گزر چکے ہیں۔ صرف ان لوگوں نے کوچ کیا جو کشمکش حیات کی وجہ سے تحت مشکلات میں تھے۔ آج ۳۰۰ سال کے بعد امریکنوں نے دماغ اور دل اور شاید جسم کی بھی بعض ایسی خصوصیتیں پیدا کی ہیں جو ان کے یورپ کے ساتھیوں سے مختلف ہیں اور بالکل نمایاں ہیں، اور ۳۰۰ سالوں میں یہ خاصیتیں زیادہ نمایاں ہو جائیں گی۔

آسمانی کروں کی طرف کوچ کی ابتدا

آسمانی کروں تک کا کوچ صرف اس وقت شروع ہوگا جب کہ انسانی کشمکش انتہا کو پہنچ جائے

گی پھر جن لوگوں پر اس کی زد سخت ترین ہوگی ان میں کا ایک گروہ انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں بیٹھ کر یا اور ناقص سامان کے ذریعے سے آسمانوں تک پہنچے گا۔ ہزاروں بلکہ کروڑوں اس کوشش میں ہلاک ہوں گے لیکن یہ اکساہٹ ہی بذات خود ان ہونے والے فوق البشروں میں وہ خاصیتیں پیدا کردے گی جو اس زمین کے باشندوں سے قطعی طور پر مختلف ہوں گی۔ پھر ایسا وقت لازمی طور پر آئے گا جب کہ "کافروں کا گروہ" کسی آسمانی کرے پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کرے گا اور تمام مشکلات کے باوجود وہاں قیام پذیر ہو جائے گا۔ صرف تخیل ہی بتا سکتا ہے کہ انسان کے جسم میں کیا عظیم تبدیلیاں اس وقت تک ہو جائیں گی لیکن انسان کے ارتقا کی ابتدا لازماً ہو جائے گی۔ تمام نسل انسانی کا مجموعی علم ہی اس جدوجہد کو مفید نتائج تک پہنچائے گا۔ انسان کی خود ساختہ جیومیٹری اور علم الطبیعات کا علم تو نہیں بلکہ فطرت کی جیومیٹری اور علم الطبیعات کے علم نے ہی اس دہشتناک کوچ کے لئے راہ صاف کی ہوگی اور یہ کوچ علم الٰہی کے طلوع کا پیش خیمہ ہوگا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صرف یہی زمین ہی اس کائنات کے مسخرین کی قوم کو پیدا کرنے میں مدد دے گی یا دوسرے حصوں کے باشعور وجود بھی اس حیرت انگیز اور لڑکھڑا دینے والی دوڑ میں شامل ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس سوال کے جواب دینے میں ہم وہم کی طرف مائل ہو جائیں لیکن امکان یہ ضرور ہے کہ اور باشعور مخلوق بھی خواہ وہ انسان سے کم درجہ کی بھی ہو اس تعجب خیز سامان میں ضرور ملے گی۔ اس امکان کے باوجود انسان کو اپنا کوچ یہی سمجھ کر کرنا چاہیئے کہ وہی اس خدائی فرض کو پورا کرنے کے لئے اس خلائے بیکراں میں تنہا کھڑا ہے۔ (جاری)

ایمان، عقائد اور عبادات سب کی غرض و غایت یہ اور صرف یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں میں راحت و آرام کی زندگی حاصل ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک انسان معاملات میں صادق اور اخلاق میں کامل نہ ہو جائے۔

(تعمیر ملت-263)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف وکرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد و اذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چاردیواری کے اندر احسن طریقے سے ہو سکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب و نظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم ازکم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں غرق ہوجانے کی۔

Monthly FALAH-E-ADMIYYAT

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

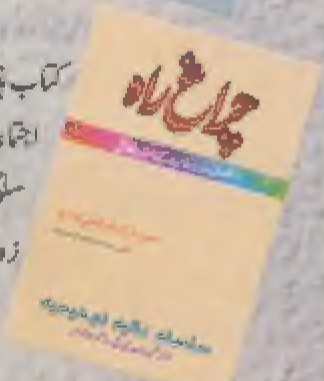

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔

سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔

زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔

تصوف منجمد اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال و اشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:-
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

Website: www.toheedia.net